ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

کاغذ کا گھوڑا کیا خوب دَوڑا

تفصیل اَندر ملاحظہ فرمائیں

اکتوبر ۸۸ء

لیور برادرز کا
بلوبینڈ مارجرین
اب اور بھی مزیدار !
Blue Band
MARGARINE
لیور برادرز کا
بلوبینڈ مارجرین
لذت ہی لذت ۔ توانائی ہی توانائی

مُدیرِ اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

مُدیرِ مسئول

تجمّل حسین چشتی

مشاورت

مشفق خواجہ ، امجد اسلام امجد

مُدیرانِ اعزازی

طاہر مسعود

محمد سلیم مُغل

مجلسِ ادارت

شاہنواز فاروقی، سیّد خورشید عالم

خطاطی

عارف سعید

جلد ۳

شمارہ ۴

اکتوبر ۱۹۸۸ء

صفر المظفر ۱۴۰۹ھ

قیمت ۶ روپے

زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

گرین گائیڈ اکیڈمی

ادارہ اشاعت برائے

تعلیم و تعمیرِ سیرتِ اطفال

زیرِ سرپرستی

ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن

ماہنامہ

آنکھ مچولی میں

شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جُملہ حقوق

بحق ادارہ محفوظ ہیں، پیشگی

اجازت کے بغیر کوئی تحریر

شائع نہیں کی جاسکتی

ماہنامہ

آنکھ مچولی

میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث

پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و

واقعات فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ

مماثلت کی صورت میں

ادارہ ذمہ دار

نہ ہوگا۔

گرین

گائیڈ اکیڈمی

برائے خط و کتابت ۱۱۲-ڈی، نورس روڈ

و مقامِ اشاعت سائٹ، کراچی

ناشر

ظفر محمود شیخ

طابع۔ زاہد علی ، مطبع۔ لاریب

پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

ایک بار کی زحمت   سال بھر کا آرام

گھر بیٹھے ہر ماہ حاصل کرنے کے لیے

آنکھ مچولی صرف ایک بار زحمت کیجیے۔

اور **۱۲** ماہ تک اپنا پسندیدہ رسالہ باقاعدگی سے حاصل کیجیے۔

آنکھ مچولی کے **۱۲** شماروں کی قیمت مع دو خاص نمبر اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ **۱۲۶** روپے بنتی ہے، لیکن خصوصی بچت اسکیم کے تحت آپ کو صرف **۹۰** روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یوں گویا بیک وقت آپ دو فائدے اُٹھا سکتے ہیں۔

(۱) **۳۶** روپے کی خصوصی بچت۔ (۲) گھر بیٹھے رجسٹرڈ ڈاک سے رسالے کی بحفاظت ترسیل۔

یاد رہے کہ رسالے کی قیمت میں اضافے کے باوجود زرِ سالانہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

اگر آپ سالانہ خریداری کے لیے ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو **۹۰** روپے کا منی آرڈر اور مندرجہ ذیل کوائف ایک علیحدہ کاغذ پر روانہ کریں۔

① خریدار کا نام ② مکمل پتہ ③ رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے ④ فون نمبر (اگر ہو) ⑤ دستخط

غیر ممالک کے لیے سالانہ شرحِ خریداری

۹ امریکی ڈالرز ۔ متحدہ عرب امارات، عمان، بحرین، قطر، دبئی، ایران، عراق، سعودی عرب، کویت، شام، ترکی، انڈونیشیا، بھارت، سنگاپور، فلپائن۔

۱۲ امریکی ڈالرز ۔ بنگلہ دیش، تھائی لینڈ، چین، جاپان، یونان، یوگوسلاویہ، زیمبیا، الجیریا، نائجیریا، آسٹریا، اٹلی، کوریا، برطانیہ، مغربی جرمنی، ڈنمارک، ناروے، فرانس، بلجیم، اسپین، سویڈن، ہالینڈ، جنوبی افریقہ، تنزانیہ، کینیا، تیونس، سوڈان، مصر، یوگنڈا، گنی۔

۱۸ امریکی ڈالرز ۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، امریکہ، کینیڈا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، پاناما۔

خصوصی بچت اسکیم "ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی - ۱۱۳ - نورس روڈ سائٹ، کراچی ۱۶

حسنِ ترتیب

نشانِ عظمت		۶
اداریہ		۷
یہی ہے سب سے اچھی بات (نظم)		۸
ڈاک ڈاک کس کی ڈاک		۹
اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟		۱۲
جو آج بھی زندہ ہیں		۱۳
کھول آنکھ زمیں دیکھ		۱۸
ٹرپ	محمد سعید اختر	۲۱
ڈاکٹر ولیم کابل		۳۴
ننھی بوند (نظم)		۳۶
ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی (انٹرویو)		۳۷
فنکار گلہری		۳۹
باعث توقیر		۴۰
کہیں آپ چٹخنی خور تو نہیں؟		۴۷
یوں گزاری ہیں چھٹیاں ہم نے		۴۹
خط کی کارستانی		۵۲
ایک انوکھی تصویر (نظم)	محسن احسان	۵۵
آپریشن قلفی		۵۶
دھماکہ (آخری قسط)	اظہر نیاز	۶۴
سائنس انکوائری		۷۲
یہ بات سمجھ میں آئی نہیں (نظم)	احمد حاطب صدیقی	۷۵
کھٹ مٹھے		۷۷
سوال در سوال	ابو اسامہ	۸۱
جانور		۸۷
اور پنکی قتل کر دی گئی	احمد حاطب صدیقی	۸۹
گنی چنی معلومات		۹۴
ساحلِ سمندر (نظم)	محمد امان خان دل	۹۷
کہانی کیسے لکھی جائے؟		۹۸
کاغذ کا گھوڑا		۱۰۲
نئی تحریریں		۱۰۳
آؤ ملائیں ہاتھ		۱۱۵
امی ابو کا صفحہ		۱۱۸

نشانِ عظمت

دو نوکر اور ایک کمسن لڑکا۔ عمر یہی کوئی گیارہ بارہ سال، ایک باغ میں دوڑ رہے تھے۔ ان کے آگے آگے ایک شیر کا بچہ تھا۔ لڑکا نوکروں سے چند قدم پیچھے تھا۔ آگے جاکر نوکروں نے شیر کے بچے کو گھیر لیا۔ جونہی ایک نوکر اس کے گلے کی زنجیر پکڑنے کے لیے جُھکا اس نے غرّا کر اپنے دونوں اگلے پنجے اُٹھا دیے۔ نوکر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا ساتھی ڈر کے مارے پہلے ہی ایک طرف ہو گیا تھا۔ کم سن لڑکا ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اس نے اطمینان سے شیر کے بچے کے جسم پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اس کی زنجیر پکڑ لی اور اُسے نوکر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو اب اسے لے جاؤ۔"

نوکر جو اب تک ڈرا ہوا تھا بولا "حضور یہ کاٹتا ہے۔"

"تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو، یہ دیکھو" لڑکے نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ شیر کے بچے کے منہ کے سامنے کر دیا۔ شیر کا بچہ لڑکے کے ہاتھ چاٹنے کے بعد اس کے پاؤں پر لیٹ گیا۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ بچپن ہی سے شجاعت کے ایسے کھیل کھیلنے والا یہ بہادر بچہ کون تھا۔ یہ بچہ فتح علی ٹیپو سلطان تھا جس نے بڑے ہو کر بھی بڑی بہادری کے ساتھ انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی اور میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔"

ان دنوں صوبۂ سندھ کے تمام اعلیٰ تعلیمی ادارے بند ہیں (کچھ عرصہ قبل لاہور کے تعلیمی اداروں میں بھی یہی صورتحال تھی) یہ تعلیمی ادارے طلبہ کے ہنگاموں کی وجہ سے غیر معینہ مدت تک کے لیے بند کیے گئے ہیں اور دوسری طرف اخبارات میں زخمی طلبا کی تصویریں اور خبریں مسلسل چھپ رہی ہیں۔ اخبارات بتاتے ہیں کہ یہ طلبا آپس کے جھگڑوں میں زخمی ہوئے ہیں۔ ان طلبا کے درمیان کیا اختلافات ہیں اور وہ کیوں آپس میں دست بہ گریباں ہیں اس کی تفصیل میں جانا ہمارا کام نہیں۔ یہ ان کا معاملہ ہے۔ اسے وہ خود بہتر سمجھتے ہوں گے۔ ہمیں تو صرف یہ فکر ہے کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں کی صورتِ حال اگر ایسی ہی تشویشناک رہی تو آئندہ ہمارے ان ساتھیوں کا تعلیمی مستقبل کیا ہوگا جو ابھی اسکولوں میں زیرِ تعلیم ہیں؟ اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ طالب علموں کے ہاتھوں میں کتابیں اچھی لگتی ہیں اسلحے نہیں۔ طالب علموں کا اوّلین فریضہ تعلیم حاصل کرنا ہے۔ اور ان کی باقی سرگرمیوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ لیکن یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ آج طالب علموں کی ثانوی سرگرمیاں ہی ان کی بنیادی دلچسپی اور توجّہ کا مرکز بن گئی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن تعلیمی اداروں کو تہذیب و تمدّن کا گہوارہ ہونا چاہیئے وہاں لاقانونیت اور ہنگاموں کا راج ہے اور جن طالب علموں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر ملک و قوم کی خدمت کرنی چاہیئے وہ اسپتال اور جیل خانوں میں بند ملک و قوم کے لیے ایک سوالیہ نشان بن گئے ہیں۔ کیا یہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ نہیں؟

ہمارے طالبِ علم باشعور ہیں۔ اور وہ اس حقیقت کو خوب سمجھتے ہوں گے کہ طالبِ علمی کی زندگی چند روزہ ہوتی ہے۔ اور اس مختصر عرصے میں ان کے کرنے کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر اپنے مضمون کے حوالے سے اتنی اہلیت اور استعداد پیدا کر لیں کہ جب عملی زندگی میں داخل ہوں تو نہ صرف اپنے والدین بلکہ معاشرے کی ان توقعات پر پورا اتر سکیں جو ان کی ذات سے وابستہ ہوتی ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ اپنے گروہی اختلافات کو حل کرنے کے لیے تشدّد کا راستہ اختیار کر کے وہ اپنے ان چھوٹے بھائیوں کے لیے جو ابھی نچلی جماعتوں میں ہیں کس قسم کی مثالیں قائم کر رہے ہیں؟ ظاہر ہے ہمارے طلبا اگر اپنی تعلیم کو نظر انداز کر کے ایسی سرگرمیوں میں حصّہ لیں گے جو ان کے والدین اور اساتذہ کے لیے پریشانیوں کا باعث ہوں گی تو اس میں کس کا فائدہ ہے؟ کسی کا بھی تو نہیں یہ ملک آپ کا ہے۔ یہ شہر آپ کے ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے آپ ہی کی ذہنی نشوونما کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ پھر اگر انہیں نقصان پہنچتا ہے تو درحقیقت یہ کس کا نقصان ہے؟ تعلیمی ادارے تو ایسی فیکٹریاں ہوتی ہیں جہاں نسلیں ڈھلتی ہیں۔ اگر آپ اس کا تحفّظ نہ کر سکے تو پھر آپ کا تحفّظ کون کرے گا؟ خدارا اپنے آپ کو پہچانیئے۔ اپنی ذمّے داریوں کو پہچانیئے۔ آپ ہی اس ملک کے امین ہیں۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

یہی ہے سب سے اچھّی بات

دین خدُا کا ہم پہچانیں؛ بات رسولؐ اللہ کی مانیں
ہم اللہ کو واحِد جانیں پاک ہے اُس کی ذات
یہی ہے سب سے اچھّی بات

اللہ ہی کو مالِک جانیں خالق سمجھیں کامل جانیں
جو مانگیں اللہ سے مانگیں ہم سب ہی دن رات
یہی ہے سب سے اچھّی بات

جب ہم کوئی کریں ارادہ دیکھیں کیا ہے حُکم خدا کا
پھر ہم مانیں اُس کا کہنا! کچھ بھی ہوں حالات
یہی ہے سب سے اچھّی بات

ایک نہ ایک دن وہ آئے گا نیک و بد "پرکھا" جائے گا
مومن بندہ ہی پائے گا جنّت کے باغات
یہی ہے سب سے اچھّی بات

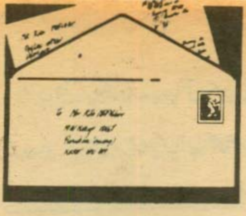

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

حامی مرید عباس، شجاع آباد ۔ آپ نے گزشتہ تین ماہ میں چار خط بھیجے ۔ اور اب یہ آپ کا آخری خط ہے ۔ جس کے بعد آپ کوئی خط نہیں لکھیں گے اور آنکھ مچولی سے آپ کی دس ماہ پرانی دوستی ٹوٹ جائے گی۔ بھئی بات یہ ہے کہ آپ کے خط میں کوئی ایسی بات ہی نہیں ہوتی جس کا جواب دیا جائے ۔ جیسے اس خط میں دھمکی دینے کے علاوہ آپ نے کچھ لکھا ہی نہیں ہے ۔ بھلا بتائیے اس کے بعد شکایت کیسی!

محمد اقبال، اورنگی ٹاؤن، کراچی ۔ "ڈاک ڈاک" پر کسی کی اجارہ داری نہیں ۔ اس پر صرف اچھے خطوط کی اجارہ داری ہے ۔ عادل منہاج نے واقعی غیر مہذبانہ حرکت کی ہے ۔ اس کا ہم نے نوٹس لیا ہے ۔

محمد رضوان، اورنگی ٹاؤن، کراچی ۔ آپ کے انعامی لطیفے پر رسالہ ارسال کیا جائے گا ۔ پریشان نہ ہوں۔ رسالے کی قیمت میں اضافہ کاغذ کی مہنگائی کی وجہ سے کیا گیا ہے ۔ اگر ہم صفحات میں اضافہ کر دیں تو پھر قیمت بڑھانے کا فائدہ کیا ہوا؟

آصف قریشی، واہ کینٹ ۔ بھئی سکے جمع کرنے کا طریقہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم ۔ البتہ ہم آپ کو اس سے بہتر شوق بتا سکتے ہیں ۔ آپ اچھی اچھی کتابیں جمع کیا کریں ۔ کتابیں جمع کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ آپ اُن کا مطالعہ کر سکتے ہیں ۔ جس سے آپ کی معلومات بڑھ جائے اور آپ کی بہت جلد ایک لائبریری بن جائے گی ۔ آنکھ مچولی میں مزاحیہ تحریریں، نظمیں تو اکثر و بیشتر چھپتی رہتی ہیں ۔

ملک جاوید اقبال، راولپنڈی ۔ آپ ہمیں ایسی شخصیات پر مضمون بھیجیے جن پر معلومات کم ملتی ہیں اور جو آج کی دنیا کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں ۔ ہر دو تین مہینے پر کسی کے خط کا جواب دینا ممکن نہیں ہوتا ۔ کیونکہ خطوں کا ایک انبار لگا ہوتا ہے ۔ آپ کچھ خیال نہ کیجیے گا ۔

ارشاد فرید ۔ نارتھ ناظم آباد ۔ کراچی ۔ آپ کو غیر ملکی بچے کیوں اچھے نہیں لگتے؟ بچے اپنے ہوں یا غیروں کے، ملکی ہوں یا غیر ملکی بہر حال بچے ہیں پیار اور توجہ کے مستحق ... "سوال در سوال" میں کوپن پالیسی کے تحت شائع کیا جاتا ہے ۔ آپ نے جس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بھی کسی حد تک اہم ہے لیکن اسے ہماری مجبوری سمجھیے ۔ پرچے پر آپ تنقید بھی کیجیے اور اچھے اچھے مشورے دینا بھی نہ بھولیے ۔

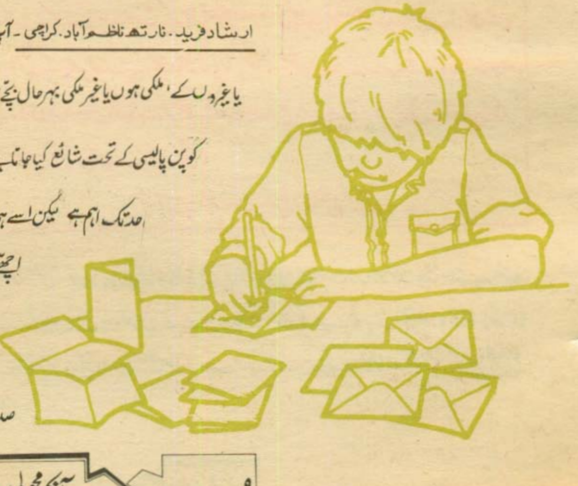

فرخ ۔ کراچی ۔ کراچی ٹیلی وژن نے 'آنکھ مچولی' میں شائع ہونے والا احمد حاطب صدیقی کا مزاحیہ مضمون "گل سبزی منڈی یادگاری مشاعرہ"۔

نہ صرف پیش کیا بلکہ ایک بد دیانتی یہ بھی کی کہ احمد حاطب صدیقی کے بجائے حسن اکبر کمال صاحب کا نام ٹیلی کاسٹ کیا جیسے یہ مشاعرہ انہی کا تحریر کردہ ہو۔ بہر حال ہم نے صبر کیا آپ بھی صبر کیجیے۔

ممتاز احمد قریشی، مکلی، ٹھٹھہ۔ آپ کو اپنی کہانی چھپنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ انتظار کرنا تو ویسے ہی تکلیف دہ ہوتا ہے، اور کہانی چھپنے کا انتظار تو بس مت پوچھیے۔ قیامت ہی گزر رہی ہوگی۔ ہم کوشش کریں گے کہ آپ کا یہ انتظار جلد سے جلد ختم ہو سکے۔

خرم معراج۔ سکھر۔ خوش آمدید، خوش آمدید۔ آپ کو ہم اپنی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں "حق اسکواڈ" اب انشاءاللہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے گا۔ رسالے کی کتابت آپ کو پسند آئی۔ ہمیں حیرت ہے آپ نے رسالے کی ایسی خصوصیت کی تعریف کی جس پر عام طور پر توجہ کم دی جاتی ہے۔ شکریہ۔ شکریہ۔

اخلاق احمد، کوٹکے، مانسہرہ۔ صدر ضیاءالحق شہید کے متعلق آپ کا مضمون ملا مضمون میں آپ نے جن جذبات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے ہم متفق ہیں۔ ہماری قوم اس وقت نہایت کٹھن دور سے گزر رہی ہے۔ دعا کیجیے اللہ ہمارے مسائل حل کرے۔

محمد سلیمان۔ لاڑکانہ۔ آپ کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ "آنکھ مچولی" آپ ہی جیسے علم کے شوقین ساتھیوں کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ اگر اس کے مطالعے سے اگر آپ کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو سمجھیے رسالہ نکالنے کا مقصد پورا ہوا۔

آپ نے آنکھ مچولی کی قیمت میں اضافہ کر دیا ہے اور وجہ آپ نے یہ بتائی ہے کہ کاغذ مہنگا ہو گیا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ کاغذ اس قدر مہنگا کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ دوسری بات یہ کہ کاغذ کی قیمت کے بڑھتے ہی رسالے کی قیمت میں اضافہ کرنے سے مسئلہ کہاں حل ہوتا ہے۔ اصل مسئلہ تو کاغذ کو مہنگا ہونے سے روکنے کا ہے اور اس سلسلے میں تمام رسالے والوں کو مل کر ہی کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔

میں آنکھ مچولی کی توسط سے حکومت کی توجہ اس اہم مسئلے کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ ایک طرف تو علم کی روشنی پھیلانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ خواندگی کی شرح میں اضافہ کیا جائے جبکہ دوسری طرف کاغذ کی قیمت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیم اور کاغذ لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے کاغذ کو سستا کیے بغیر تعلیم سستی نہیں ہو سکتی۔ ایک غریب آدمی جس کی روزانہ آمدنی پچیس تیس روپے ہوتی ہے۔ اس کے لیے چھ روپے کا رسالہ خریدنا یا ساٹھ ستر روپے کی کتاب خریدنا ناممکن ہے۔ رسائل اور کتابوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ علم کے دروازے غریب اور متوسط طبقے کے آدمی پر بند کیے جا رہے ہیں۔ کیا حکومت اس سنگین مسئلے پر توجہ دینا پسند کرے گی؟

(محمد ابراہیم خان۔ مرغز، ضلع صوابی)

نیلم سلمیٰ (شہر کا نام نہیں لکھا) ننھی بہن سلمیٰ! تمھارا پیارا پیارا سا خط ملا۔ تم ابھی پانچویں جماعت میں ہو لیکن ماشاءاللہ بے انتہا ذہین ہو اور ذمہ دار بھی۔ تم نے لکھا ہے کہ تم اب کے چھٹیوں میں سیر و تفریح کے لیے نہیں جا سکیں کیونکہ گھر کے کام میں امی اور باجی کا ہاتھ بٹانا پڑا۔ واقعی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ابھی سے کام کاج کی عادت آگے چل کر بہت مفید ثابت ہوتی ہے لیکن موقع نکال کر سیر و تفریح بھی ہونی چاہیئے۔ آنکھ مچولی کی پسندیدگی کا شکریہ۔

نجمہ نور، حیدرآباد ۔ آپ کا یہ مشورہ بہت اچھا ہے کہ مسلمان مشاہیر کے متعلق مضامین شائع کیے جائیں۔ تاکہ بچّے اپنی تاریخ کی عظیم شخصیات سے باخبر رہیں۔ ایسے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کا ایک مضمون چھپ بھی چکا ہے کچھ اور بھی تو لکھیے۔

محمّد شاہد رسول، حیدرآباد ۔ آپ کے خطوط کے جوابات کی لکھائی اب پہلے جیسی باریک نہیں رہی اس لیے اُمید ہے کہ آپ کی شکایت دُور ہوچکی ہوگی۔ آپ نے کسی دانشور کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جو امید پہ جیا' اس نے خود کو دھوکا دیا۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ امید باندھنے کے ساتھ ساتھ عمل کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ آپ کے خط کا جواب دیا جارہا ہے۔ اس لیے اب یقیناً آپ کی شکایت دُور ہوچکی ہوگی۔

محمّد رفیع، کوشیاں ۔ معلوماتِ عامّہ کا مقابلہ "سوال در سوال" کی صورت میں شائع ہو رہا ہے اس لیے آپ کی شکایت سمجھ میں نہیں آئی۔ رسالے کی دن دونی رات چوگنی ترقی آپ لوگوں کے تعاون اور دعاؤں کی بدولت ہے۔ سائنس سے متعلق مستقل سلسلہ اور دیگر مضامین۔ آپ کی نظر سے یقیناً گزرے ہوں گے۔

ارشد عمران (شہر کا نام نہیں لکھا)۔ سالانہ خریدار بننے کا طریقہ رسالے میں درج ہوتا ہے۔ آپ سالانہ خریداری کی رقم منی آرڈر کردیجیے۔ رسالہ آپ کو جاری کردیا جائے گا۔

قرۃ العین علی، پشاور ۔ لیجیے آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی کہ ہم خوشامد پسند ہیں۔ یوں تو تعریف کسے اچھی نہیں لگتی لیکن ہم تو تنقید کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور تنقیدی خطوط کا جواب نہایت اہتمام سے دیتے ہیں۔ حق اسکواڈ، کی کہانیوں کا فی الحال صرف ایک ہی حصّہ شائع ہوا ہے۔ دوسرے حصّے کے لیے انتظار کیجیے۔

رئیس احمد، پشاور ۔ صدر ضیاء الحق کی حادثاتی موت کا سانحہ واقعی قوم کے لیے کڑی آزمائش تھا لیکن قومیں آزمائشوں کی بھٹی سے زندہ و توانا ہوکر نکلتی ہیں۔ دشمن کے عزائم انشاءاللہ خاک میں مل کر رہیں گے اور ہم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ کر رہیں گے۔

سعیدۃ النساء، شورکوٹ، کینٹ ۔ آپ نے آنکھ مچولی کی جتنی تعریف کی ہے اس سے سچ تو یہ ہے کہ ہمارا حوصلہ بڑھا۔ آپ کی دعائیں اور مشورے ساتھ رہے تو انشاءاللہ یہ رسالہ ابھی اور ترقی کرے گا۔ ہمیں آپ کی تجاویز اور مشوروں کی ضرورت رہے گی۔ رسالے کے کمزور پہلو کون کون سے ہیں؟ کن کن تبدیلیوں سے رسالے کے حُسن میں اضافہ ہوگا؟ ظاہر ہے آپ لوگ جن چیزوں کی طرف توجّہ دلائیں گے۔ اس سے ہمیں رسالے کو بہتر بنانے میں مدد بھی ملے گی۔

امجد فاروق، گجرات ۔ بھئی آنکھ مچولی، ہفت روزہ تو نہیں ہوسکتا، ہم کوشش کریں گے کہ اسے روزنامہ بنا سکیں۔ بچّوں کا ایک روزنامہ بھی تو ہونا چاہیئے... کیوں؟ ارررر اسے سچ نہ سمجھ لیجیے گا۔ آپ کی اس محفل میں پہلی بار شرکت سے روشنی سی آگئی ہے؟

صبیح الدّین خان، حیدرآباد ۔ آپ نے کہانیاں بھیجیں ہم خاموش رہے، آپ نے لطیفے بھیجے ہم خاموش رہے، آپ نے مقابلوں میں حصّہ لیا، ہم خاموش رہے۔ اب آپ نے "سوال در سوال" کے جوابات بھیجے ہیں۔ کیا ہم اب بھی خاموش رہیں گے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ آپ کے جوابات درست ہوئے تو آپ کا نام لازماً شائع ہوگا اور انعام بھی ملے گا۔

کامران رحیم، کراچی ۔ آپ نے اپنے دوست محمّد علی کی جو خوبیاں بیان کی ہیں اُسے پڑھ کر ہم متاثر ہوئے۔ آپ مناسب سمجھیں تو اپنے دوست کے ساتھ کسی دن دفتر تشریف لائیے۔ آنے سے پہلے فون پر مطلع کردیجیے۔ اور ہاں محمّد علی کی جن رسالوں میں تحریریں ہوئی ہیں اُسے بھی ساتھ لیتے آئیے۔

مُحمّد اسلم شیخوپوری

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

صفر المظفّر

اسلامی سال کا دوسرا مہینہ ہے۔ لغت میں صفر کے معنیٰ ہیں خالی ہونا۔ جب عرب لوگ "صفر المکان" کہتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ مکان خالی ہوگیا۔ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب چار مہینوں میں لڑائی کو حرام سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ فطری طور پر جنگجو لوگ تھے۔ ان کی خاندانی لڑائیاں سالہا سال تک جاری رہتی تھیں۔ علاوہ ازیں ان میں سے بعض افراد قافلوں اور بستیوں پر ڈاکے ڈال کر اپنی روزی کماتے تھے مگر ان چار مہینوں میں وہ ہر قسم کے جنگ و جدل، چوری چکاری اور ڈاکہ زنی سے باز آجاتے تھے۔ ان چار مہینوں میں سے پہلا مہینہ محرّم کا تھا، محرّم میں وہ پورے وقار اور سکون کے ساتھ گھروں میں بیٹھے رہتے مگر جونہی محرّم گزر جاتا یہ لوگ حریف قبیلوں کے ساتھ لڑنے اور ڈاکہ زنی کے لیے گھروں سے نکل جاتے اور ان کے گھر خالی ہوجاتے اس وجہ سے اس مہینے کو صفر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اُن کے گھروں کے خالی ہونے کا مہینہ تھا۔

صفر کے ایک معنیٰ "زرد ہونا" بھی ہے، چونکہ یہ مہینہ موسم خزاں کا تھا۔ اس میں درختوں کے پتّے زرد ہوجاتے تھے اور شاخیں پتّوں کے زیور سے خالی ہونے لگتی تھیں اس لیے بھی اس مہینے کو صفر کہا جاتا ہے۔ صفر میں اسلامی تاریخ کے جو نمایاں واقعات پیش آئے ہیں، ان میں سے سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ۲۸ صفر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مرض الوفات میں مبتلا ہوئے، آپ کی بیماری سر درد سے شروع ہوئی، پھر اُس نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ آپؐ چند دنوں کے بعد وفات پاگئے۔ تاریخ اسلامی کی مشہور شخصیت حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی وفات بھی ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ کو ہوئی۔

عظمت کا مینار

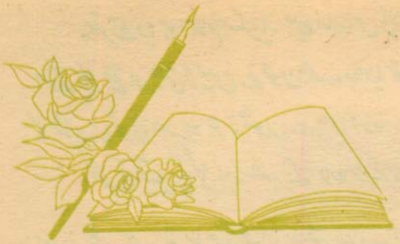

وہ جو آج بھی زندہ ہیں !

صَدف حُسنین کاظمی

آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ زمین آگ اُگل رہی تھی۔ شدت کی گرمی سے چٹانیں تک تڑخ رہی تھیں پرندے درختوں میں چھپے بیٹھے تھے اور انسان اپنے اپنے گھروں۔ خیموں میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ لُو کی شدّت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔! ہر طرف شدت کی گرمی تھی۔

اس عالم میں وہ تپتی زمین پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اور اس کی کمر پر بھاری پتھر رکھا ہوا تھا۔

"تڑاخ۔ تڑاخ۔ تڑاخ۔" پے در پے کئی کوڑے اس پر پڑے۔

بھاری پتھر تلے دبا ہوا اور دہکتی زمین پر پڑا ہوا جسم اوپر سے کوڑوں کی مار پر تلملایا ضرور۔ لیکن اس نے کوئی آہ و بکا نہیں کی۔ ہاں اس کے ہونٹ مسلسل ہلتے رہے۔

"بول — اب بھی باز آئے گا یا نہیں"؟ کوڑے بردار نے غصّے سے گرج کر پوچھا۔

پتھر کے بوجھ تلے دبے دبے اس حبشی نے انکار میں سر ہلایا اور کوڑے بردار نے غصّے سے دو چار کوڑے اور رسید کر دیئے۔

"باز نہیں آئے گا تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا۔" وہ غصّے سے دہاڑا۔

حبشی غلام نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلایا اور اس کے لب بدستور حرکت کرتے رہے معلوم نہیں وہ کس لفظ کی تکرار کر رہا تھا اور اس تکرار میں وہ قیامت کی گرمی اور اپنے جلتے بدن کو اور اس پر پڑتے کوڑوں کی کوئی پرواہ نہیں کر رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر مار پیٹ اس پر بے اثر ہو چکی ہے۔

"دیکھ باز آجا۔ محمدؐ کا دین چھوڑ دے۔ ورنہ وہ حشر کروں گا کہ یاد رکھے گا۔"

مالک نے ایک بار پھر کوڑا لہرایا۔

حبشی غلام نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلا دیا اور بدستور اسی لفظ کی تکرار کرتا رہا۔ جھنجھلاہٹ اور غصّے میں مالک نے اس کو مزید دو چار کوڑے رسید کئے اور آس پاس کھڑے لوگوں سے گرج کر کہا۔" اس مردود کو رسیوں سے باندھ کر شہر کے لڑکوں کے حوالے کر دو۔"

پتھر تلے دبا ہوا غلام مسکرایا۔ جیسے اسے اس کی پسند کی چیز مل گئی ہو۔ گرمی کی شدت سے اس کے لب سوکھ چکے تھے اور جلتی زمین نے خون تک جلا دیا تھا۔ جسم پر جگہ جگہ زخموں کے نشانات تھے۔ اس کے بدن کا شاید ہی کوئی حصہ ہو جو زخموں سے نہ بچا ہو۔

حکم کی تعمیل کی گئی اور شہر کے آوارہ لڑکے اسے رسیّوں میں جکڑ کر گلیوں، رستوں، بازاروں میں گھسیٹتے پھرنے لگے۔ ایک تو پہلے ہی زخموں سے چُور بدن ـــ اوپر سے گرمی کا عذاب اور رہی سہی کسر اس طرح گھسیٹنے سے پوری ہوگئی تھی۔ مگر معلوم نہیں۔ اس حبشی کا جسم کس چیز کا بنا ہوا تھا۔ اس پر کسی کا اثر ہی نہیں ہو رہا تھا اور وہ بدستور ایک ہی لفظ دہُرائے جا رہا تھا جس کو تپتی ریت نے سنا تھا، دہکتے پتھروں نے اور گرم ہوا نے بھی سُنا تھا، شجر و حجر نے سنا تھا۔ در و دیوار نے سنا تھا ـــ "اَحد اَحد اَحد" (اللہ صرف ایک ہے۔ صرف ایک ہے۔ صرف ایک ہے۔") لیکن جن کے دلوں پر مہر لگ چکی تھی۔ وہ اس آواز کو نہیں سن پا رہے تھے۔ اور اس لفظ کو زمین آسمان کی ہر شے نے سنا تھا۔ اور اپنے سینے میں جذب کر لیا تھا ـــ یونہی دن گزرتے رہے۔ ایک دن اِدھر سے ایک نیک شخص گزرا۔ اس نے یہ حال دیکھا تو کہا "اے ابنِ خلف۔ خدا سے ڈر۔ اس غلام کو اذیّت نہ دے۔"

اُمیّہ بن خلف غصّے سے بگڑ کر بولا "تمہیں اس سے کیا۔ ابن ابی قحافہؓ۔ اس سے ایسی ہی ہمدردی ہے تو اسے خرید لو ـــ اور جو چاہو کرو۔ ورنہ جب تک یہ محمدؐ کا دین نہیں چھوڑے گا۔ اس کے ساتھ یہی سلوک کروں گا تم بھی اس کے حمایتی بن گئے ہو۔"

اور پھر ایک دن حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اس مظلوم غلام کو نہایت بھاری قیمت دے کر خرید کر اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا۔

اُمیّہ بن خلف ہنس کر بولا "میں تمہاری جگہ ہوتا۔ تو اس کم بخت غلام کے بدلے دھیلا بھی نہیں دیتا۔ تم نے اتنی رقم دے ڈالی کہ اس کے درجن بھر غلام خریدے جا سکتے ہیں۔"

خریدنے والا مسکرایا۔ "ابنِ خلف۔ تم کیا جانو ـــ اس غلام کی قیمت کیا ہے۔ میں نے جو کچھ دیا۔ وہ اس کی قیمت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں"

اُمیّہ بڑبڑاتا رہا ـــ "ہونہہ ـــ یہ غلام ـــ جس کا باپ بھی میرا غلام تھا اور ماں میری کنیز ـــ اس کے بدلے اس بے وقوف امیر نے اتنے پیسے دے ڈالے۔"

بلالؓ کو آزادی مل گئی۔ لیکن وہ آزاد ہو کر بھی اس کا غلام بن گیا تھا، جس کی غلامی پر ہزاروں بادشاہیاں اور ہزار آزادیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔

بلالؓ — رباح نامی ایک حبشی غلام کے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ ایک عرب سردار کی بیٹی تھیں — جو ایک جنگ میں اُمیہ بن خلف کے خاندان کے ہاتھ آئیں۔

اس وقت تک آفتاب نبوّت طلوع نہیں ہوا تھا — اور سرزمین عرب پر جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ کوئی برائی نہ تھی جو عربوں میں نہ پائی جاتی ہو — اللہ کا پاک اور مقدس گھر خانہ کعبہ تک میں تین سو ساٹھ بت تھے۔ جن میں لات، عزیٰ اور ھبل بڑے بڑے بت تھے۔ لوگ ان کے ناموں کی قسمیں کھایا کرتے تھے — لوگوں کو پکڑ کر غلام بنا لینا۔ عورتوں کو کنیز بنا کر بیچ دینا ایک بالکل معمولی رواج تھا — جیسے آج کل مویشیوں کی منڈیاں لگتی ہیں اس طرح اس زمانے میں کنیزوں، غلاموں کی منڈیاں لگتی تھیں — اُمیہ بن خلف کے غلام رباح کی شادی اس عرب سردار کی لڑکی سے ہوئی اور اس لڑکی کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا — تھا تو غلام ابنِ غلام — اور کنیز کا بیٹا — لیکن قدرت نے اسکی غلامی کے لئے پیدا کیا تھا — جس کے لئے ہزار بادشاہتیں قربان کی جا سکتی ہیں۔

آفتاب رسالتؐ طلوع ہوا — روشنی چاروں طرف پھیلتی چلی گئی — اور اس کی کرنوں نے رباح کے سیاہ فام بیٹے کے سینے میں دھڑکنے والے دل میں بھی جگہ بنا لی اور اسے روشن کر دیا — اور اس روشنی میں اس نے پہچان لیا کہ لات وعزیٰ ہو یا ھبل یا کوئی اور بت کوئی بھی برحق نہیں — حق پر صرف وہ ہے جس نے سب کچھ بلا شرکت غیرے پیدا کیا ہے اور حکمرانی کا حق بھی اسی کا ہے اور بندگی بھی صرف اس کی ہو سکتی ہے اور محمدؐ بن عبداللہ — اللہ کا آخری رسولؐ ہے اس نے سچائی کی گواہی دی تو اس کا استقبال اسی طرح ہوا جیسے ہمیشہ سچی گواہی دینے والوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہیگا۔

اور اب دہکتی ریت تھی، تپتے پتھر تھے، تیز گرم لُو تھی، زخموں سے چُور چُور بدن تھا — کوڑوں کی مار تھی — اور گلیوں میں گھسیٹتے پھرنا تھا — لیکن — اس احد احد کی تکرار میں کوئی کمی نہیں تھی — جیسے یہ لفظ ہی تمام زخموں کی دوا اور ہر درد کا علاج ہو — جتنا اس پر مار پڑتی وہ اتنا ہی اور اپنے دین پر مزید جمتا چلا جاتا — جیسے سونے کو آگ میں ڈالو — تو وہ اور کندن بن کر نکلتا ہے۔

اور پھر وہ وقت بھی آیا — جب مکہ فتح ہوا۔ فاتح مکہ نے — کعبۃ اللہ کا دروازہ کھول کر اس کو تین سو ساٹھ بتوں سے پاک کیا — اور پھر بلالؓ کو حکم دیا — کہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دو۔

پھر چشم فلک نے یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا — وہی سیاہ فام غلام ابن غلام — جس کو کل تک مکے کی گلیوں میں آوارہ لڑکے گھسیٹتے پھرتے تھے — جس کے جسم کا کوئی حصہ زخموں سے نہیں بچا تھا — وہ آج سرزمین عرب ہی نہیں پوری دنیا کے مقدس ترین مقام کے بلند ترین حصے پر کھڑا ہے — اور اس کی نگاہیں رحمتوں کے اس پیکر جمیلؐ پر ہیں — اور اس نے کعبہ کی چھت سے — ساری دنیا کی مظلوم اور زخم خوردہ انسانیت کے لئے پیغام خیر نشر کیا۔

"بلالؓ — سنا تم نے۔ تمہارا کیا مرتبہ ہم نے دیکھا ہے"؟ زبانِ نبوتؐ سے ارشاد ہوا

"جی کیا فرمایا"؟ بلالؓ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم نے تمہیں — بہشت میں اپنے سے آگے آگے جاتے دیکھا اور تمہاری جوتیوں کی آواز سُنی ہے —" اللہ کے رسولؐ نے فرمایا۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے" بلالؓ کو حیرت تھی ۔ لیکن گواہی دینے والا دنیا کا سب سے سچّا انسان تھا، اور اس کی بات کس طرح غلط ہوسکتی تھی ۔ ؟

حبش کا سیاہ فام غلام زادہ آج اس مرتبے پر پہنچا ہوا تھا ۔ جہاں عمر فاروقؓ نے بھی اسے سیدنا بلالؓ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

اُمیہ بن خلف — مرچکا ہے۔ لیکن بلالؓ ابن رباح آج بھی زندہ ہے — جب تک اس زمین کے کسی بھی گوشے میں — بحر و بر میں، خشک وتر میں، مشرق ومغرب میں — صبح کے جالوں اور شام کے دھندلکوں میں — جہاں کہیں اذان بلند ہوتی ہے — وہاں وہ اس حبشی غلام کے مقدر کے اُجالے کی داستان بھی سناتی ہے اور قیامت تک سناتی رہے گی — اور جب تک یہ صدا بلند ہوتی رہے گی — مؤذنِ رسولؐ کا نام لوگوں کے دلوں میں گونجتا رہے گا — کہ اس نام کو اس نام سے وابستگی حاصل ہے۔ جسؐ کی تعریف میں خود خدا نے فرمایا ہے کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اور اقبال نے کہا کہ کسیؐ کو دیکھتے رہنا نماز تھی تری

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا — وہ حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوتی ترے دم سے اس غم کدے کی آبادی — تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی۔
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لئے — کسیؐ کے شوق میں تونے مزے ستم کے لئے
اذاں ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی — نماز اسؐ کے نظارے کا اِک بہانہ بنی

اور — بلالؓ آج بھی زندہ ہے — اور جب تک اذان ۔ تکبیر الٰہی کی آواز دنیا میں گونجتی ہے — بلالؓ کا نام زندہ رہے گا۔"

جوابات پزل صفحہ نمبر ۱۷

A وہیل مچھلی B چھپکلی C چوہا D جنگل مُرغ E شارک مچھلی F خنزیر G امریکی بندر H کچھوا J کنگارو K شیر L دریائی گھوڑا۔ M خرگوش O ایروگ ایک دریائی جانور P بچھو

دُم جانوروں کی خوبصورتی میں بھی اضافہ کرتی ہے اور ان کے کام بھی آتی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں یہ دُمیں کن جانوروں کی ہیں۔؟

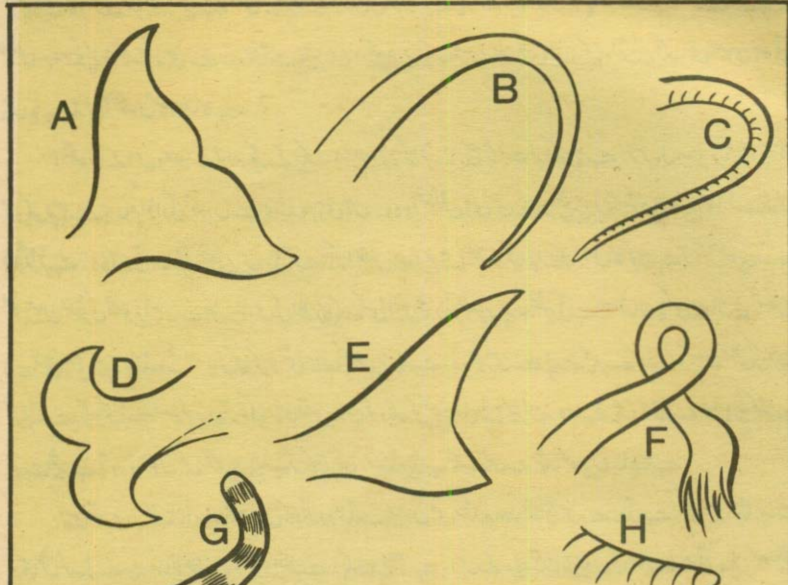

(جوابات کے لیے سامنے کا صفحہ دیکھیئے)

آپ نے اکثر مشاہدہ کیا ہوگا کہ بادل کا آوارہ ٹکڑا غور سے دیکھنے پر خرگوش محسوس ہوتا ہے۔ یا دُور سے ایک پہاڑی ٹیلا ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی تنوُ مند گھوڑا ہو۔ کسی لمبی چھڑی سے کھیلتے کھیلتے یکایک ہمیں احساس ہوتا ہے کہ چھڑی کا آخری سرا جو مُڑ گیا ہے، کسی زرافے کے گردن کی طرح ہے یا رات کے وقت جو چاند نکلتا ہے اس میں کوئی بڑھیا بیٹھی ہے جو چرخہ کات رہی ہے۔ دو مختلف چیزیں دیکھنے پر ایک جیسی لگنے لگتی ہیں۔ کیا واقعتاً یہ ایک ہی جیسی ہوتی ہیں یا یہ ہماری آنکھوں کا دھوکا ہے..؟

آنکھوں کے اس دھوکے کو امریکہ کے ایک ذہین فوٹوگرافر نے سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ جیل بی سینڈ ویڈ ایسی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے جو عام افراد کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ وہ واشنگٹن ڈی سی میں واقع نیچرل ہسٹری میوزیم کا اسٹاف فوٹوگرافر ہے۔ وہ قدرتی مناظر کی تصویریں بناتا ہے تاکہ انھیں میوزیم میں محفوظ کیا جا سکے۔ اس کا کہنا ہے کہ اکثر فطرت کے کسی حسین منظر کی تصویر اُتارتے ہوئے اس کی نظر یکایک کسی ایسی قدرتی تصویر پر جا ٹھہرتی ہے جو انسان یا کسی حیوان کی شکل سے ملتی جلتی ہو۔ سینڈ ویڈ یہ دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑتا ہے۔ وہ تیزی سے اپنے کیمرے کا رُخ اُس شکل کی طرف کر لیتا ہے، کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ لوگ ایسی تصویروں کو دیکھ کر بچّوں کی طرح حیران رہ جاتے ہیں "میرے خدا! یہ کتنا حیرت انگیز ہے!" وہ دانتوں میں انگلیاں داب کر کہتے ہیں۔ سینڈ ویڈ اب تک ایسی بے شمار تصویریں بنا چکا ہے۔

ایسی تصویروں کا بنانا آسان کام نہیں کیونکہ دو مختلف چیزوں میں مشابہت اتفاق ہی سے ہوتی ہے۔ پھر اس مشابہت کو تلاش کرنے کے لیے مناظرِ فطرت کو گہری نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جستجو انتظار اور اچھی نظر، سینڈ ویڈ کے اندر یہ تینوں خوبیاں موجود ہیں۔

وہ پھولوں کے کُنج میں، جنگلی پودوں اور درختوں کے جھنڈ میں، لمبی گھاس سے بھری جھیلوں میں اُترتا اور میدانوں میں مارا مارا پھرتا ہے، اس جستجو کے ساتھ کہ کوئی پھل ایسا مل جائے جو چوزے کی طرح ہو، دو ٹہنیاں اس طرح گلے ملتی دکھائی دیں جیسے دو کٹھ پتلیاں ہوں، کسی درخت کی بل کھاتی جڑ سانپ کی طرح سرسرا رہی ہو۔ اور جب اُسے ایسا کوئی منظر نہیں ملتا تو پھر وہ انتظار کرتا ہے اس لمحے کا جب ایسا ہو جائے۔ اس کی روشن آنکھیں گھومتی رہتی ہیں چاروں طرف تاکہ کوئی ایسی چیز بچ کر نہ نکلنے پائے جو اس کے کیمرے کا سرمایہ ہو۔

سینڈ ویڈ کا کہنا ہے کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں، اگر آپ قدرت کے مختلف مناظر کو توجہ کے ساتھ دیکھیں گے تو آپ کو بھی قدرتی مناظر میں ایسی بہت سی شبیہیں نظر آجائیں گی۔ سینڈ ویڈ کا کہنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ ہمیں خوب اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں ہمیں بھی، بادل میں جانوروں کی شکلیں دکھائی دیتی تھیں لیکن جب ہم یہ شکلیں کسی کو دکھانے کی کوشش کرتے تھے تو وہ ہنس دیتا تھا... ممکن ہے سینڈ ویڈ بھی اگر زبانی اپنے یہ تجربات لوگوں کو سُناتا تو وہ بھی ہنس کر ٹال دیتے، لیکن انسانی آنکھ کو آپ جھٹلا سکتے ہیں، کیمرے کی آنکھ کو جھٹلانے کی کس میں ہمت ہے...؟

کھول آنکھ
زمیں دیکھ
فلک دیکھ
فضا دیکھ

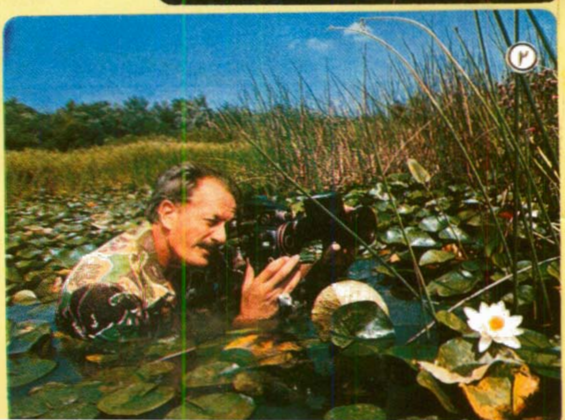

(١) غور سے دیکھیے ممکن ہے نظر آجائے
پھول میں بھوت چھپا بیٹھا ہے.

(٢) ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے
مسٹر ویڈ، مطلوبہ شاٹس کے لیے گہرے پانی میں

(٣) کٹے درخت سے نکلی یہ
شکل انسان کی.

(٤) پتے کو کس نے کاٹ کے
کُتّا بنا دیا؟

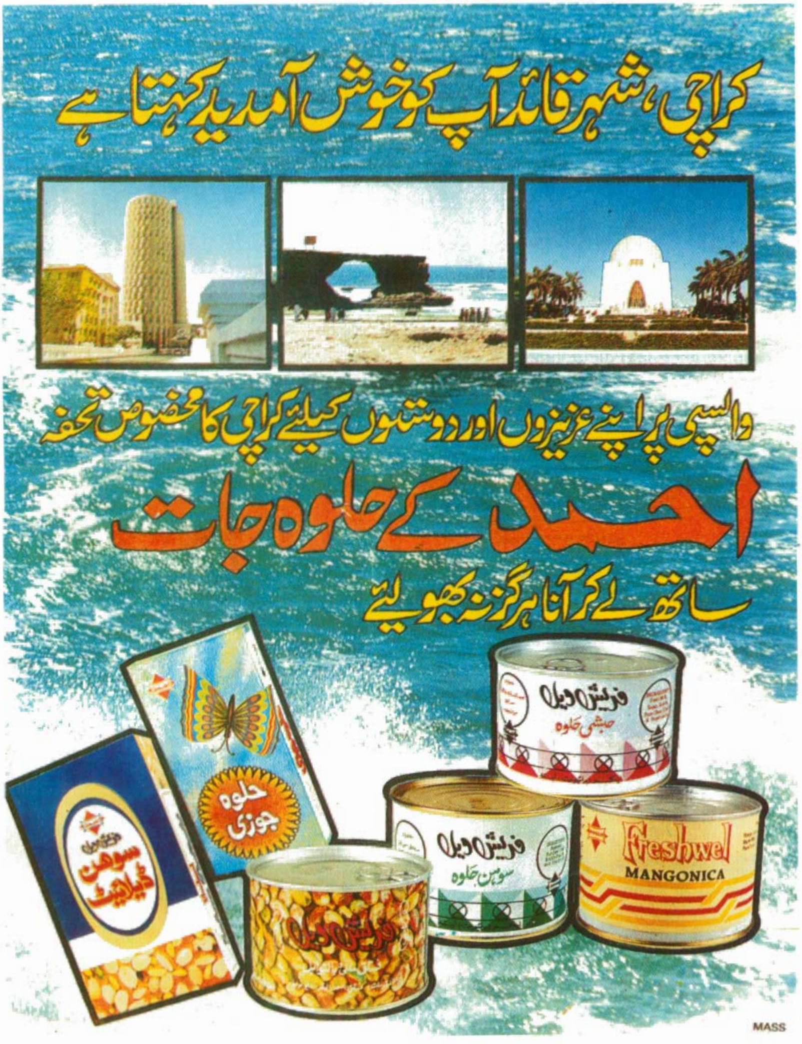
کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے
فریش ویل
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
سوہن ڈیلائیٹ
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA
MASS

محمد سعید اختر

ٹِپ

ایک خوددار لڑکے کی تاثراتی کہانی

راشد اور وحید دونوں دوست تھے اور اخبار بیچتے تھے۔ ایک مصروف چوراہے پر جہاں موٹر کاروں، بسوں اور موٹر سائیکلوں کا ہجوم رہتا تھا، وہ ہاتھوں میں اخبارات لیے سُرخ بتی روشن ہونے کا انتظار کرتے اور جیسے ہی چوراہے پر کسی ایک طرف کے سگنل کی سُرخ بتی روشن ہوتی اور تیزی سے دوڑتی ہوئی موٹر کاروں کے ڈرائیور ایک دم بریک لگا کر رُکتے، وہ دونوں بے اختیار اخبار لہراتے ہوئے موٹر کاروں کی طرف دوڑتے۔ قیمتی کاروں میں سوار بے فکرے لوگوں میں سے بعض ایک نگاہِ غلط ڈالتے ہوئے دوسری طرف متوجہ ہو جاتے اور بعض اخبارات کی جھلک دیکھتے ہوئے کوئی نہ کوئی اخبار خرید لیتے۔

ان دونوں کی عمریں تیرہ چودہ سال کے قریب تھیں۔ وحید کو یہ کام کرتے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ بہت چھوٹی عمر سے ہی یہ کام کرنے لگا تھا۔ جب کہ راشد کو ابھی دو سال ہوئے تھے۔ راشد چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے پارٹ ٹائم

کے طور پر اخبارات بیچنے کا کام شروع کیا تھا۔ راشد نے مجبوری میں یہ قدم اُٹھایا تھا کیوں کہ اُس کا باپ اچانک لاپتہ ہو گیا تھا۔ وہ کسی عرب مُلک میں کمانے کی غرض سے گیا تھا۔ چند ماہ تو وہ باقاعدگی سے پیسے بھیجتا رہا، پھر اچانک لاپتہ ہو گیا۔ پچھلے تین سال سے اُس کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ یوں راشد نے اپنے تعلیمی اور گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے اخبارات بیچنے شروع کر دیے۔

اس کی ماں بھی کپڑے سی پرو کر کچھ کما لیتی تھی۔ وہ چار بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑا راشد ہی تھا۔ اس لیے اب گھر کی ساری ذمے داری اُس کے ناتواں کندھوں پر آپڑی تھی۔ اکثر ان کے گھر فاقے ہوتے، ایسے میں وہ وحید کے متعلق سوچنے لگتا تھا۔ وحید اخبارات فروخت کیے بغیر بھی کافی رقم کما لیتا تھا۔ کیوں کہ وہ بھیک یا بخشش لینے کا عادی تھا۔

مالدار اور دولت مند لوگوں کو ٹِپ دینے کی بہت عادت ہوتی ہے۔ ایسے ہی دولت مند لوگ جب ان سے کوئی اخبار یا رسالہ خریدتے تو ٹِپ یا بخشش کے طور پر بقایا پیسے اُنھیں رکھنے کا کہہ کر مُنہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ اور کبھی کبھی تو کوئی اخبار خریدنے کے بجائے ویسے ہی اُنھیں کچھ پیسے دینے کی کوشش کرتا۔ ایسے میں وحید تو بڑی خوشی خوشی وہ ٹِپ وصول کر لیا کرتا تھا۔ وہ تو دُعا ہی یہ کرتا رہتا تھا کہ کوئی اخبار خریدنے کے بجائے اُسے کچھ پیسے دے جائے۔ لیکن راشد نے نہ تو کبھی ٹِپ لی اور نہ ایسی بخشش۔ وہ اُن لوگوں کو بقایا پیسے واپس کر دیا کرتا تھا۔ دولت مند خریدار اُسے زبردستی کچھ دینے کی کوشش کرتے مگر وہ صاف انکار کر دیتا اور تیزی سے آگے بڑھ جاتا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی بخشش اور ٹِپ ایک طرح کی بھیک ہی ہوتی ہے اور وہ کوئی بھکاری نہیں ہے۔ وہ جتنے پیسوں کا اخبار لوگوں کو فروخت کرتا ہے، اُسی میں اُس کا کمیشن ہوتا ہے اور یہی اُس کی محنت کا صلہ ہے۔ روزانہ اس کا کمیشن صرف پانچ چھ روپے ہی بنتا تھا۔ کبھی کبھی زیادہ بھی ہو جایا کرتا تھا۔ جب کہ وحید بیس پچیس روپے روز ٹِپ کے طور پر کما لیتا تھا۔

وحید اُس کا خوب مذاق اُڑاتا تھا کہ وہ کیسا احمق اور پاگل ہے، جو مُفت میں آئے ہوئے پیسوں کو ٹھکراتا ہے۔ راشد اُس سے کہتا کہ یہ بھی بھیک کی ایک شکل ہے اور وہ بھکاری نہیں ہے۔

وحید قہقہہ مار کر کہتا: "تم تو ہو ہی پاگل۔ بھلا یہ بھیک تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو ٹِپ ہے۔ ہم اُن سے خود تھوڑا ہی مانگتے ہیں وہ اپنی مرضی اور خوشی سے دیتے ہیں۔"

راشد خاموش ہو جاتا۔ وہ جانتا تھا کہ وحید کو سمجھانا مشکل ہے لیکن کبھی کبھی جب اُن کے گھر فاقے ہوتے اور کھانے کو کچھ بھی نہ ہوتا تو ایسے میں وہ سوچتا کہ وہ بھی وحید بن جائے لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کا دل اُسے ٹوک دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

ان دنوں راشد کے امتحان ہونے والے تھے اور امتحانی فارم جمع ہو رہے تھے۔ راشد نے ابھی تک امتحانی فارم

جمع نہیں کروایا تھا اور کل فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی۔ اس کی فیس میں پُورے نو روپے کم تھے۔ اُس نے کئی مہینوں میں کچھ نہ کچھ بچت کر کے فیس کے پیسے جمع کیے تھے مگر چند دن ہوئے چھوٹی بہن کی بیماری میں کافی رقم خرچ ہوگئی تھی اور اب ماں بھی بیمار تھی، ورنہ وہی اُسے کہیں سے پیسے لا دیتی۔

اس وقت شام گہری ہو چکی تھی اور آٹھ بجنے والے تھے۔ وہ روزانہ آٹھ بجے تک اخبار بیچتے تھے۔ کیوں کہ مالک نے اُنھیں آٹھ بجے تک کا ہی وقت دیا ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ دُکان بند کر دیا کرتا تھا۔ اس وقت تک راشد نے جتنے اخبار بیچے تھے اس میں اس کا کمیشن پانچ روپے کے قریب بن رہا تھا۔ اس طرح اس کی فیس میں اب پورے چار روپے کم تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ چار روپے کہاں سے لائے؟ وہ سخت فکر مند اور پریشان تھا۔ ماں کے پاس بھی پیسے نہیں ہوں گے۔ اور اب تو شاید گھر میں کھانے کے لیے بھی کچھ نہ ہو۔

"کل آخری دن ہے، اگر میں نے فیس جمع نہیں کروائی تو میرا سال ضائع ہو جائے گا۔ اور میں اگلی کلاس میں نہیں پہنچ سکوں گا۔" یہ سوچ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اسی وقت اچانک بریک چرچرائے اور وہ چونک کر اخبار لہراتا ہُوا گاڑیوں کی طرف بھاگا۔ وحید بھی دوسری طرف سے دوڑا تھا۔ راشد گاڑیوں کے سامنے اخبار لہراتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک کار والے نے اُسے روک لیا۔ اُس نے سرسری طور پر اخبارات دیکھے اور ایک اخبار لے کر پیسے نکالنے کے لیے بٹوا نکالا اُسی وقت سگنل کُھل گیا۔ ٹریفک ایک دم رواں ہو گیا۔ کار والے نے جلدی سے ایک نوٹ کھینچا اور اس کے ہاتھ میں تھما کر بریک پر سے پاؤں ہٹا لیا۔

"صاحب! بقایا تو لے لیں"۔ راشد نے کہا۔

"رکھ لو!" کار والے نے کہا اور تیزی سے کار آگے بڑھا دی۔ راشد ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ پانچ کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ عجیب کش مکش میں مبتلا ہو گیا۔ وہ انگریزی اخبار صرف ایک روپے کا تھا۔ اور اس پانچ روپے کے نوٹ میں سے بقایا چار روپے اُسے واپس کرنا تھے مگر کار والا وہ چار روپے بطور ٹِپ اُسے دے کر جا چکا تھا۔ یہ چار روپے اُس کے مستقبل اور تعلیم کے لیے بہت اہمیت اختیار کر گئے تھے اور یہ پانچ کا نوٹ اُس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ اس کے مستقبل کی ضمانت۔ وہ اب بآسانی امتحانی فیس دے سکتا تھا۔ اس کی فیس کی رقم پُوری ہو گئی تھی۔ لیکن یہ پیسے کیا واقعی اُسی کے ہیں؟ کیا ان پر اس کا حق بنتا ہے؟ پانچ کا نوٹ اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا اور وہ سڑک کے کنارے کھڑا ہاتھ میں دبے نوٹ کو گھور رہا تھا۔

دفعتاً وحید نے اُسے چونکا دیا۔ "یار آٹھ بج چکے ہیں۔ چلو اب چلیں۔ ٹائم ہو گیا ہے، ورنہ مالک ناراض ہو گا"۔ راشد نے چونک کر وحید کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اُس کے ساتھ چل دیا۔

وہ تھوڑی دُور چلے تھے کہ اُنھیں ایک ادھیڑ عمر بھکاری نظر آیا۔ وہ ایک دُکان پر ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا اور دُکاندار تلخ اور غصیلی آواز میں کہہ رہا تھا "تم اتنے موٹے مُسٹنڈے ہو کر کوئی کام کیوں نہیں کرتے۔ چلو بھاگو یہاں سے۔ تمھیں تو پیسہ دینا بھی گناہ ہے۔ جس کو دیکھو بھیک مانگنے چلا آتا ہے۔ چلو ہٹو، یہاں سے۔ بھیک منگے!"

راشد کو یوں لگا، جیسے یہ سب کچھ اُسے کہا گیا ہو۔ اُس کا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

وہ رات راشد کے لیے بہت پریشان کُن تھی۔ وہ ساری رات نہ سو سکا۔ وہ کیا کرے؟ اُس کی امتحانی فیس پوری ہو چُکی تھی مگر کیا وہ بھیک نہیں تھی۔ اور اُس نے وہ بھیک لے لی تھی... تو کیا وہ ایک بھکاری بن گیا ہے؟ لیکن نہیں وہ بھکاری نہیں ہے۔ وہ بھیک نہیں لے سکتا۔ اگر آج اُس نے ٹپ لے لی تو پھر وہ ہمیشہ ٹپ لینے کا عادی بن جائے گا— اور یہ ٹپ اور بخشش بھیک ہی تو ہے! جو پیسے محنت کیے بغیر آجائیں وہ بھیک کے پیسے ہوتے ہیں۔ ان پیسوں پر اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ کوئی حق نہیں — پھر وہ کیا کرے؟

اُسے ماسٹر صاحب کے وہ الفاظ یاد آرہے تھے، جو اُنھوں نے بھکاریوں کے متعلق کہے تھے۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ "بھیک لینے والوں کے چہروں پر قیامت کے دن کھال نہیں ہوگی اور اُن کی جگہ صرف جہنّم ہی میں ہوگی۔"

اُسے وہ سارے مناظر یاد آرہے تھے۔ جب بھکاریوں کو دُھتکارا جاتا تھا۔ اُنھیں دھکّے دیے جاتے تھے۔ مگر بھکاری پھر بھی وہاں سے نہیں ٹلتے تھے۔ کیا اُن کے جذبات نہیں ہوتے۔ وہ احساس سے عاری ہوتے ہیں؟ کیا اس کے بھی جذبات نہیں ہیں؟ کیا وہ بھی اب بھکاری بن گیا ہے۔ اور بھکاری بن کر زندہ رہے گا۔ نہیں — وہ بھکاری نہیں ہے۔ وہ بھکاری نہیں بن سکتا وہ وحید نہیں ہے... وہ راشد ہے۔ راشد!

صُبح وہ گھر سے نکلا تو اُس نے وہ چار روپے ایک ایسے معذور بھکاری کو دے دیے جو واقعی اس کا حق دار تھا۔ اب راشد مطمئن تھا۔ اُس نے بڑے فخر سے گردن اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وسیع اور نیلا آسمان۔ اور چمکیلا سُورج اُسے بہت اچھا لگا۔ وہ بُڑبڑایا "اللہ میاں! مجھے معاف کر دے۔ میں بھٹک گیا تھا۔"

راشد اسکول پہنچا تو ماسٹر صاحب نے کہا "راشد! تم نے ابھی تک فیس جمع نہیں کروائی؟" راشد نے گردن جُھکا دی۔

"بولو بھئی کیا بات ہے۔ شاباش"۔ ماسٹر صاحب نے کہا۔

"سر! میری فیس میں چار روپے کم ہیں!" راشد نے دھیرے سے کہا۔

"کیا صرف چار روپے کم ہیں"۔ ماسٹر صاحب بڑبڑائے اور پھر کچھ سوچ کر بولے "تم ایک ہونہار بچّے ہو۔ تمھارا سال ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ اچھا ایسا کرو۔ یہ لو، چار روپے اور فیس جمع کرا دو۔"

راشد نے بے بسی سے ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا اور بولا "نہیں سر! میں... میں نہیں لے سکتا۔"

"ارے بھئی کیوں نہیں لے سکتے۔ اچھا ایسا کرو، یہ تم قرض سمجھ کر رکھ لو۔ جب تمھارے پاس ہوں تو مجھے واپس لوٹا دینا۔"
راشد کی آنکھیں ایک دم چمک اُٹھیں۔ قرض۔ ہاں واقعی قرض وہ لے سکتا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر چار روپے ماسٹر صاحب سے لے لیے۔ بطور قرض۔ اور فیس جمع کرا دی۔

وہ خوش تھا کہ اُس کا سال ضائع ہونے سے بچ گیا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اللہ بڑا مُسبّب الاسباب ہے۔ اگر وہ چار روپے کی ٹپ قبول کر لیتا تو اُس کا ضمیر ہمیشہ اُسے ملامت کرتا رہتا۔ اللہ یقیناً اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے اور اُسے خوشی تھی کہ وہ اس امتحان میں پورا اُترا تھا۔ اُس نے ٹپ جو نہیں لی تھی۔ اُس کا دل خوشی سے سرشار تھا۔

۱۰۴ صفحات پر مشتمل

راہنما

سچّی قرآنی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ

قرآن کی یہ سچّی کہانیاں بچّوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں

اس کے حصول کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر ارسال کر دیجیے۔

تعلیم الاسلام ۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات
جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے

تالیف :۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مُفت منگوانے کے لیے
صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر دیجئے۔

ننّھی بُوند

شاھنواز فاروقی

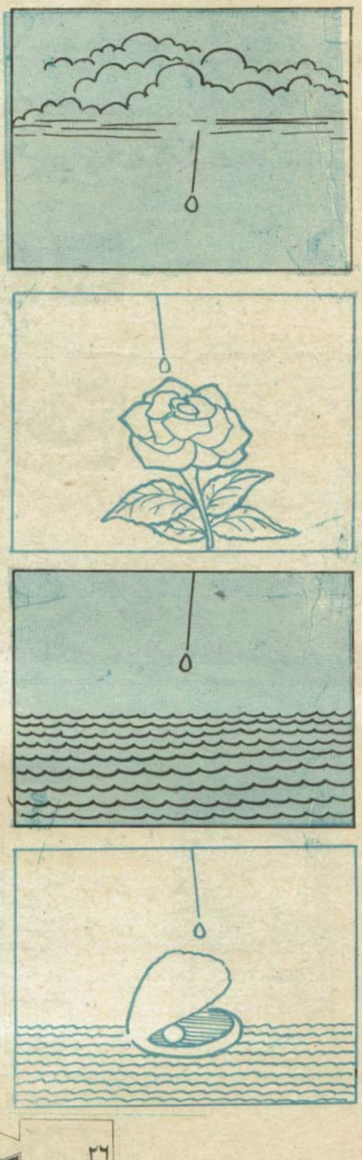

اِس دفعہ کے موسمِ برسات میں
ایک ٹھنڈی گھُپ اندھیری رات میں
ایک ننّھی بُوند آنکھیں میچتی
ہچکچاتی ، آہ ٹھنڈی کھینچتی
چھوڑ کر بادل کی گودی جُوں چلی
خود سے وہ یہ گفتگو کرنے لگی
یہ اندھیری رات اور لمبا سفر
دیکھئے ہوتا ہے کیا میرا حشر
عین ممکن ہے گِروں میں پھول پر
یہ بھی امکاں ہے گِروں میں دھُول پر
کیا خبر تندور میں گِر جاؤں میں
دیکھتے ہی دیکھتے مَر جاؤں میں
ایسے اندیشوں کے سنگ لڑتی ہوئی
بُوند ساحل پر بحر کے آ گئی
تھی وہاں پر ایک سیپی مُنہ کھُلی
وہ اُسی میں جا گِری موتی بنی

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی تجربہ گاہ میں مصروفِ تحقیق۔

بین الاقوامی شہرت کے حامل سائنسدان سے نازیہ رمضان کی خوبصورت گفتگو!

اپریل، کا مہینہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ اس لیے نہیں کہ اس ماہ کراچی میں بدترین گرمی پڑی بلکہ اس لیے کہ مجھے ایک ایسی شخصیت سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی، جن پر ہمارا ملک بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مُراد ڈاکٹر سلیم الزّماں صدیقی سے ہے۔ کیوں کہ ایسی شخصیتیں ہمارے مُلک میں ہیں ہی کتنی۔ ڈاکٹر صاحب بین الاقوامی شہرت کے حامل سائنسداں ہیں۔ لیکن یہ ان کی شخصیت کا صرف ایک رُخ ہے۔ وہ ایک مانے ہوئے مصوّر بھی ہیں۔ سائنس اور فنونِ لطیفہ ایک دوسرے کی ضِد سمجھتے جاتے ہیں لیکن یہ دونوں علوم و فنون ڈاکٹر صاحب کی ذات میں آکر ایک ہوگئے ہیں۔ وہ ۱۹ اکتوبر

۱۸۹۷ء میں بھارت کے شہر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ برِصغیر پاک و ہند کے نامور حکیم اجمل خان ان پر خاص توجّہ فرماتے تھے۔ انھوں نے ہی ڈاکٹر صاحب کو جرمنی بھیجا جس جرمنی میں ڈاکٹر صاحب نے ایک بُوٹی اسرول پر جسے چھوٹی چاند بھی کہا جاتا ہے تحقیقی کام کیا۔ مذکورہ بُوٹی کو حکیم اجمل خان نے بلڈپریشر، ہسٹریا اور جنون و دیوانگی کے علاج کے لیے استعمال کرنا شروع کیا تھا جرمنی سے واپس آنے کے بعد بھی انھوں نے اپنا تحقیقی کام جاری رکھا اور " اجملین" کے نام سے اس کا جوہر نکالا جو آج یورپ میں بھی مذکورہ امراض کا کامیاب علاج تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی انہی خدمات کے عوض مغربی جرمنی کی فرینکفرٹ یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی۔

ڈاکٹر صاحب کے وقت کا بیشتر حصّہ لیبارٹری میں مختلف قسم کے تجربات میں گزرتا ہے اور جب سائنس کی ٹھوس حقیقت سے وہ تھک جاتے ہیں تو برش اور رنگوں سے جی بہلانے لگتے ہیں۔ برف کی طرح سفید بال، گہری سوچ میں ڈوبی آنکھیں، بھرّیوں بھرا چہرہ، چھوٹا ساقد، مشفق، مہربان، پُرخلوص شخصیت کے مالک ڈاکٹر سلیم الزّماں صدیقی سے ہماری ملاقات جامعہ کراچی کے حسین ابراہیم جمال انسٹیٹیوٹ میں ہوئی۔ جہاں لیبارٹری ہی کے ایک حصّے میں انھوں نے اپنا آفس بنا رکھا ہے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے پہلے ہی وقت طے کر لیا تھا۔ لہٰذا جب ہم ان سے انٹرویو کے لیے پہنچے تو اس وقت بھی وہ اپنی تجربہ گاہ میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ ان کے شاگردوں کی ایک تعداد بھی کام میں لگی ہوئی تھی، ڈاکٹر صاحب وقفے وقفے سے انھیں ہدایات بھی دیتے جا رہے تھے اور میرے سوالوں کے جواب بھی۔

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کے بے شمار انٹرویو ہوئے ہوں گے، لوگوں نے آپ سے بہت مشکل مشکل سوالات پوچھے ہوں گے۔ لیکن آج میں آپ سے بہت ہلکی پھلکی باتیں کرنے آئی ہوں، آپ کے بچپن کے متعلق کچھ باتیں۔

ڈاکٹر سلیم الزّماں صدیقی:۔ ہاں بھئی بالکل ٹھیک ہے جو پوچھنا چاہتی ہو شوق سے پوچھو۔

سوال:۔ براہِ کرم اپنے بچپن کے ماحول اور تعلیم کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیے۔

ڈاکٹر صدیقی:۔ بھئی دیکھو! ہمارے بچپن کی تعلیم تو یہ تھی کہ پہلے بغدادی قاعدہ پڑھایا جاتا تھا۔ اس کے بعد کلامِ مجید شروع کیا جاتا تھا۔ کلامِ پاک ختم کرنے میں چھ مہینے لگتے تھے۔ اس کے بیچ میں مولانا اسماعیل میرٹھی کی پانچ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس سے اُردو بھی آجاتی تھی۔ پھر آمدنامہ فارسی کا پڑھا۔ یہ گھر کی تعلیم تھی۔ والد صاحب نے کہا تھا کہ بیٹا یہ اٹھارہ صفحے ہیں آمدنامے کے، ان کو اچھی طرح پڑھ لو اور سمجھو کہ فارسی آگئی۔ چونکہ مجھے پہلے سے تھوڑی بہت فارسی آتی تھی اس لیے جلدی ہی سیکھ گیا۔ اور پھر فارسی اور اُردو کی وجہ سے انگریزی سیکھنی آسان ہوگئی۔ آج کل صورت یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم میں نہ عربی ہے نہ فارسی۔ اس کے نتیجے میں جو طالب علم ہمارے ہاں آتے ہیں ایم ایس سی پاس کر کے ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے، وہ کام تو بہت اچھا کرتے ہیں لیکن جب انگریزی میں لکھنا پڑتا ہے تو میں بتا نہیں سکتا کیسی بچکانہ تحریریں ہوتی ہیں۔ ہمارے زمانے کے میٹرک پاس طالب علم کو مہارت کے ساتھ انگریزی لکھنی آتی تھی۔ اس لیے

میری یہ نصیحت یاد رکھو کہ کوئی پڑھائے یا نہ پڑھائے اپنے طور پر فارسی ضرور پڑھو۔ صرف آمد نامہ کے اٹھارہ صفحے پڑھ لو اور سمجھ لو فارسی آ گئی۔!

سوال:۔ آپ کے بچپن کے مشاغل اور مصروفیات کیا ہوتی تھیں؟

ڈاکٹر صدیقی:۔ دیگر بچوں کی طرح کہانیاں پڑھنے اور سننے کا بہت شوق تھا۔ پہلے بچپن میں امی جان اور بہنوں سے کہانیاں سنیں اور پھر جب پڑھنا آیا تو کہانیوں کی کتابیں پڑھیں۔ اسکول کے زمانے میں عبدالحلیم شرر کے تمام ناول پڑھے۔ پھر وہ کتابیں جو منع تھیں چھپ چھپ کر پڑھتے تھے۔ طلسم ہوشربا، داستانِ امیر حمزہ کی یہ موٹی موٹی کتابیں۔ مئی جون کی گرمیوں میں چھت پر جہاں کوئی آتا جاتا نہیں تھا دو اینٹوں کا تکیہ بنا کر ناول پڑھا کرتے تھے۔ اس طرح الّم غلّم پڑھنے کی جو عادت پڑی تو پھر اچھی اچھی اور کام کی باتیں بھی پڑھیں۔ پھر بچپن میں ہی علامہ شبلی نعمانی کی کتابیں پڑھ لیں۔ انگریزی ادب کا مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا۔

سوال:۔ اچھا تو آپ اپنے پسندیدہ مصنف اور کتاب کا نام بتلائیے؟

ڈاکٹر صدیقی:۔ مجھے روسی ادیب دوستوفیسکی بہت پسند ہے جتنا کچھ انھوں نے لکھا میں نے سب پڑھا ہے۔ ان کے ناول "ایڈیٹ" کا تو جواب ہی نہیں۔ میں نے ایک دفعہ جرمن زبان میں اور دو مرتبہ انگریزی میں اس کا ترجمہ پڑھا۔ اس کے علاوہ جرمن مصنف تھامس مان جس کے مقابل جرمن ادب میں کوئی دوسرا ادیب نہیں۔ بچپن میں مولانا اسماعیل میرٹھی کی کتابوں نے گہرا اثر چھوڑا۔

سوال:۔ آپ کھیل کون سا کھیلا کرتے تھے؟

ڈاکٹر صدیقی:۔ فٹ بال کھیلا کرتے تھے اور ہاکی۔ اکثر چوٹ لگتی رہتی تھی کبھی پیر ٹوٹا، کبھی ہاتھ ٹوٹا۔ ایک دفعہ گول کیپری کرتے ہوئے کندھے پر اس زور کی کِک پڑی کہ کئی روز تک پٹیوں میں جکڑے رہے۔

سوال:۔ آپ کا پسندیدہ مضمون کون سا تھا؟

ڈاکٹر صدیقی:۔ ادب اور شعر سے بہت لگاؤ تھا۔ تاریخ کا مضمون بھی دلچسپ لگتا تھا۔

سوال:۔ اسکول جاتے وقت آپ کو جیب خرچ کتنا ملتا تھا اور اسے کس طرح خرچ کرتے تھے؟

ڈاکٹر صدیقی:۔ اسکول جب جاتے تھے تو دو پیسے ملتے تھے تو جب اسکول میں آدھی چھٹی ہوتی تھی تو ایک پیسے میں چار چیزیں کھاتے تھے آلو کے کچالو، چھولے، دہی بڑے اور کچوری اور ایک پیسے کی مٹھائی چم چم۔

سوال:۔ آپ کے بچپن کی پسندیدہ شخصیت کون سی تھی؟

ڈاکٹر صدیقی:۔ میں اپنے بڑے بھائی کی شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ سب سے بڑے بھائی خلیق الزماں صاحب تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکن تھے۔ ان سے چھوٹے بھائی سمیع الزماں صاحب مغل اسکول آف آرٹ کے نامور مصور مانے جاتے تھے۔

سوال:۔ آپ بچپن میں کس قسم کی شرارتیں کیا کرتے تھے؟

ڈاکٹر صدیقی: شرارتیں کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ بھئی دیکھو، میرے دو چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی دیکھ بھال میں میرا زیادہ وقت گزرتا تھا۔

سوال: آپ کی کبھی کسی بات پر پٹائی ہوئی تھی؟

ڈاکٹر صدیقی: (مسکراکر) پٹائی! بھئی میرے ایک بھائی جو تھے وہ ہمیشہ نرمی سے سمجھاتے تھے۔ کبھی کسی بات پر نہ مارا نہ ڈانٹا۔ لیکن دوسرے جو تھے وہ ایسی پٹائی کرتے تھے، ایسی پٹائی کہ تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔

سوال: اپنی زندگی یا بچپن کا کوئی یادگار واقعہ تو سنائیے؟

ڈاکٹر صدیقی: (سوچتے ہوئے) بچپن کا تم نے ذکر کیا تو میری پہلی یاد جو ہے وہ دو برس کی عمر تک جاتی ہے۔ مجھے میری کھلائی (آیا) گاؤں لے کر گئی کسی سے ملنے۔ وہاں اس نے بے دھیانی میں مجھے ایک گھنے درخت کے نیچے تنہا بٹھا دیا۔ یہ دو برس والی بات مجھے ایسی اچھی طرح یاد ہے عجیب قصّہ ہے یادداشت کا۔ خیر اسے والدہ نے بڑی ڈانٹ پلائی اور دوسرے دن وہ بھاگ گئی۔ ایک اور آیا تھی اس کا نام بدھنی تھا اس لیے کہ وہ بدھ کے دن پیدا ہوئی تھی۔ دوسری یادداشت جو ہے وہ اسکول کے زمانے کی ہے۔ ایک روز کھیلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک بگ یعنی وہ کیڑا جو گوبر میں ہوتا ہے اسے گبریلا کہتے ہیں۔ ہاں! تو اس بگ نے کچھ غلیظ مٹی لے کر اس کی ایک گول گول چکنی چکنی گولی بنائی اور پھر وہ اُسے دھکیلتا ہوا لے چلا۔ یہ گولی اس کی غذا تھی۔ مجھے اس کی یہ حرکت بڑی عجیب لگی۔ یہ تو بچپن کا ایک مشاہدہ تھا لیکن اس سے میں نے بعد میں یہ نتیجہ نکالا کہ اس گبریلے کی ساری کائنات یہی گولی ہے۔ تو اپنی زندگی اس گبریلے کی زندگی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ گولی ضروریاتِ زندگی کو ظاہر کرتی ہے یعنی گھر بار، ساز و سامان، مکان، موٹر، وغیرہ تو اگر ہم نے خود کو بھی یہیں تک محدود کر دیا اور اپنی ضروریات کی گولی کو دھکیلتے رہے تو کوئی بات نہ ہوئی۔ زندگی میں کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ہر وقت اپنے سُکھ کے لیے سامانِ آسائش جمع کرتے رہنا اچھا نہیں ہے۔ اس سے انسان کی سوچ اور فکر تنگ ہو جاتی ہے، تو اپنی زندگی اس انداز کی نہ ہو کہ صرف ایک گولی بن کر رہ جائے۔

سوال: بچپن میں آپ کا بڑے ہو کر کیا بننے کا ارادہ تھا؟

ڈاکٹر صدیقی: بھئی بچپن میں تو ہمیں تاریخ اور ادب میں مزہ آتا تھا۔ ہمارے گھر والے چاہتے تھے کہ ہم ڈاکٹر بنیں جب ساتویں جماعت میں پہنچے تو سائنس لے لی۔ پھر انٹر سائنس کیا اس کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لینا تھا لیکن ہمارا دل فلسفہ میں اٹکا ہوا تھا۔ اس لیے بڑے بھائی جان کو خط لکھا کہ پہلے میں فلسفہ اور فارسی میں بی اے کروں گا پھر میڈیسن پڑھوں گا۔ انھوں نے بہت سمجھایا کہ اس سے دو سال ضائع ہوں گے لیکن جناب ہم بھی مسلسل درخواست کرتے رہے آخر انھوں نے اجازت دے دی۔ انٹر سائنس کے دوران ہی ہمیں میڈیسن سے زیادہ نامیاتی کیمیا سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ہم انگلستان گئے تو تھے ڈاکٹری کرنے کے لیے لیکن پھر بھائی صاحب کے مشورے پر جرمنی جا کر کیمیا کی تعلیم شروع کر دی۔ وہیں سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ بھارت واپسی پر طبیہ

کالیج انسٹی ٹیوٹ دہلی میں ریسرچ شروع کی۔ پھر قیام پاکستان کے بعد پی سی ایس آئی آر سینٹر میں چیئرمین رہے۔ نیشنل سائنس کونسل میں بھی چیئرمین رہے۔ اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں حسین ابراہیم جمال انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری سے مستقل وابستہ ہوں یہاں میری مصروفیت کا دائرہ خاصا لمبا ہے خصوصیت سے نیم، سدابہار وغیرہ کے پودوں پر ریسرچ کی اور کافی کامیابی بھی حاصل کی۔ ہمارے کئی فارمولوں کی بنیاد پر دوائیں بنیں جو دنیا بھر میں استعمال ہو رہی ہیں۔

سوال:۔ آپ کو مصوری کا شوق کیسے پیدا ہوا؟

ڈاکٹر صدیقی:۔ اگرچہ میں جرمنی کیمیا کی تعلیم کے لیے گیا تھا لیکن وہاں فرینکفرٹ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران میری دلچسپی ماڈرن آرٹ میں زیادہ تھی۔ کیمسٹری میں کوئی خاص مزہ نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے ڈاکٹریٹ بھی کر لی لیکن جب میں نے طبیہ کالج انسٹی ٹیوٹ دہلی میں واپس آکر کام شروع کیا تب کیمیا سے میری صحیح معنوں میں دلچسپی پیدا ہوئی اور پھر اس میں لگن بڑھتی گئی۔ ہاں! تو مصوری کے بارے میں یہ ہے کہ میرے بڑے بھائی جناب سمیع الزماں صاحب کا مغل آرٹ پر بڑا اعلیٰ اور منفرد کام تھا۔ میں انہیں کام کرتے بغور دیکھا کرتا تھا۔ میرے بھائی مجھ سے دس برس بڑے تھے ان سے میں نے کافی اثر لیا۔ اس کے بعد فرینکفرٹ میں کچھ ایسی صورت تھی کہ لیبارٹری میں ہم کام بھی کر رہے ہیں اور ڈرائنگ بھی کر رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں پہلی مرتبہ میری ڈرائنگز اور پینٹنگز کی نمائش جرمنی میں ہوئی۔ اخبارات میں بڑی تعریف ہوئی خصوصاً ڈرائنگ کی، پھر سنہ ۱۹۲۷ء میں دوسری مرتبہ نمائش ہوئی اور اس میں میری ایک ہزار سے زیادہ جرمن مارک کی ڈرائنگز اور پینٹنگز فروخت ہوئیں چنانچہ میں نے جو پہلا پیسہ کمایا وہ مصوری کے ذریعے تھا۔

سوال:۔ آپ نے سائنس اور آرٹس دونوں شعبوں میں یکساں لگن سے کام کیا اور کامیاب بھی رہے تو کیا آپ کو اپنے بچپن اور نوجوانی کے دور میں ان تمام مشاغل کے لیے وقت مل جاتا تھا؟

ڈاکٹر صدیقی:۔ بھئی وقت کا تم نے ذکر کیا تو دیکھو، مولانا اسماعیل میرٹھی کی تیسری کتاب میں وقت کی جو تعریف لکھی گئی ہے وہ یہ ہے

وقت کی تنگی فراخی ایسی ہے جیسے ربڑ
کھینچنے سے بڑھتی ہے چھوڑنے سے جاتی ہے سکڑ

اگر سارا وقت پلنگ پر لیٹ کر وقت گزارتے رہو تو سمجھو زندگی سکڑ گئی۔ انسان کو وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اور ہر وقت کچھ نہ کچھ سیکھتے رہنا چاہیے۔ خاص طور پر ایک سے زائد زبانیں ضرور سیکھو۔ اگر انسان کو زبان پر پوری طرح قدرت حاصل نہ ہو تو وہ چاہے کام اچھا کرے لیکن اسے اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا۔ انسان کی سوچ بونی رہ جاتی ہے، بونی کا مطلب ہے ٹھگنی اور اُدھوری۔

سوال:۔ آپ کو فنِ مصوری، شاعری اور ادب سے بہت لگاؤ ہے تو کیا آپ کے خیال میں سائنس اور فنونِ لطیفہ

ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں ؟

ڈاکٹر صدیقی :۔ دیکھو ! ہماری تہذیب میں یہ تمام چیزیں شامل ہیں ۔ بُوعلی سینا طبیب تھے طب کا بابا آدم کہا جاتا ہے انھیں۔ لیکن فلسفی اور ریاضی دان بھی تھے اور انھوں نے رقص کی ریاضیات پر ایک کتاب بھی لکھی ۔ (کھلکھلا کر ہنستے ہوئے) بھئی غور کیا تم نے ، ریاضیات اور وہ بھی رقص کی ۔ موسیقی میں انھیں کمال حاصل تھا ۔ تو انسان کو ایک چیز کا ہو کر نہیں رہ جانا چاہیے ۔ ایک موضوع میں قید ہو کر نہیں رہنا چاہیے ۔ زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں فلسفہ اور فارسی ضرور پڑھو ، پھر شعر و شاعری سے بھی شغف ہونا چاہیے ۔ بھئی انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے تو کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جتنا ہو سکے زیادہ سے زیادہ سیکھا جا سکے اور اس سے اچھے کام کیسے جا سکیں ۔ ایک شعر کا ترجمہ ہے کہ :۔

" میرے دل میں ہزار سُورج طلوع ہوئے لیکن ذرے کی حقیقت تک بھی نہ پہنچ پائے "۔

تو سب کچھ سیکھو اور سیکھتے رہنے کی جستجو رکھو ۔

سوال :۔ اپنا پسندیدہ شعر اور شاعر کا نام بتایئے ؟

ڈاکٹر صدیقی :۔ غالب کا تو جواب ہی نہیں ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ ساری راہیں خدا کی طرف جاتی ہیں لیکن راستے میں تھک تھک کر بیٹھ رہنے کا معاملہ ہے ۔ ان کا شعر ہے ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں !

اس کے علاوہ فیض احمد فیض اور جرمن شاعر گوئٹے بھی مجھے بے حد پسند ہیں ۔

سوال :۔ بچپن میں کن اساتذہ اور بزرگوں نے آپ کے کردار پر گہرے نقوش چھوڑے ؟

ڈاکٹر صدیقی :۔ بچپن میں مولوی اسماعیل میرٹھی کی کتابوں نے بے حد متاثر کیا ۔ پھر علی گڑھ میں فضل الرحمٰن صاحب جنھوں نے فلسفہ بڑی خوب صورتی سے پڑھایا ۔ کیمسٹری کے اُستاد پروفیسر یولیئس فان براؤن اور پروفیسر رابرٹ رابنسن ان کے علاوہ بھی بہت سے ہیں جن سے میں نے بے حد استفادہ کیا کن کن کا نام گنواؤں ۔

سوال :۔ کیا ہر بچے میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ محنت اور لگن سے عظیم انسان بن سکے ؟

ڈاکٹر صدیقی :۔ بالکل ! انسانوں کو اللہ میاں نے ذہن عطا کیا ہے اور ہر بچہ پیدائشی ذہین ہوتا ہے ۔ ہر بچے کے اندر مستقبل کا ایک کامیاب اور عظیم انسان چھپا ہوتا ہے ۔ اب یہ حالات اور انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت کو صحیح سمت استعمال کرتا ہے یا نہیں ۔

سوال :۔ آخر میں آپ بچوں کے لیے کوئی پیغام دینا پسند فرمائیں گے ؟

ڈاکٹر صدیقی :۔ میرا پیغام یہی ہے کہ بچے اپنے وقت کو ضائع نہ کریں اور اسے مفید کاموں میں صرف کریں یعنی اپنی زندگی کو سُکڑنے نہ دیں ۔ اس کے علاوہ اُردو کے ساتھ فارسی اور عربی ضرور پڑھیں اس سے انگریزی بھی آ جائے گی

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت۔ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
مستقبل کی بڑی ذمّہ داریوں کے لئے ابھی
سے اپنے ذہن کو تروتازہ اور جسم کو توانا رکھیے
غیر متوازن غذائیں انسانی جسم کی تمام
ضروریات پوری نہیں کرتیں۔
دودھ واحد غذا ہے جو انسانی جسم کو زیادہ
سے زیادہ قوّت فراہم کرتی ہے۔
سارے خواب پورے ہوں
سارے سُکھ پاؤ .... مگر
دُودھ تو پیو
قدرت کی عطا کردہ اِس انمول نعمت میں
کیلشیم، پروٹین، وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزاء
شامل ہیں۔ دُودھ کا روزانہ استعمال۔ اچھی صحت،
بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہے
دن میں دو بار دودھ پینا اپنی عادت بنا لیجیے۔
چاہیں تو دُودھ میں چاکلیٹ
یا شربت ڈال کر پی سکتے ہیں۔
یوں گویا۔
غذا کی غذا
مزے کا مزا
اشتہار برائے بہبود اطفال: منجانب ماہنامہ آنکھ مچولی، کراچی

MASS

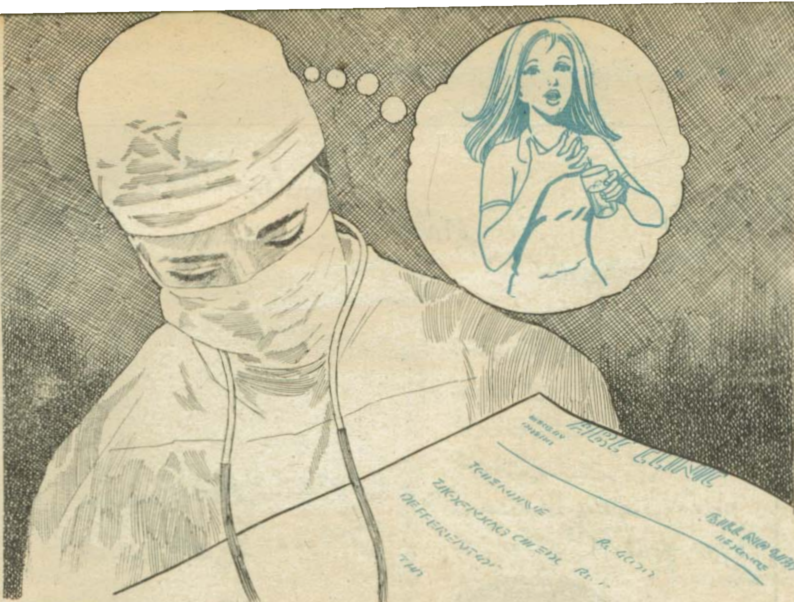

سیّد خورشید عالم

ڈاکٹر ولیم کا بِل

شربت کے ایک گلاس نے مریض کی جان بچالی

ڈاکٹر ولیم وارڈ کا راؤنڈ لگا کر اپنے کمرے میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ ان کے سیکریٹری نے بتایا کہ ایک بچی ان سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بہت دُور سے آئی ہے۔ ڈاکٹر نے اپنی سیکریٹری کو اسے اندر بھیجنے کی ہدایت کی۔ جب بچّی ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو انہوں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا "ہاں! یہ تو میری ہے" انہوں نے سوچا۔

ہرے بھرے کھیتوں کا سِلسلہ دُور تک پھیلا ہُوا تھا۔ اور اُس کے درمیان سے گزرتی ہوئی سڑک پر ایک کار چلی جارہی تھی۔ کار چلانے والے شخص کی نظریں ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر کسی سروس اسٹیشن یا ریسٹورنٹ کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ تاکہ وہاں رُک کر پیاس بُجھائی جاسکے۔ لیکن دُور دُور تک کسی ہوٹل یا سروس اسٹیشن کے آثار نہ تھے۔ تھوڑی دیر بعد اُسے کچھ دُور ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا۔ اس شخص نے گاڑی کی رفتار کم کی اور مکان کے سامنے گاڑی روک کر اُترا۔ اور دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد ایک چھوٹی سی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ دروازے پر کھڑے اجنبی کے لباس اور

اس کے سنجیدہ انداز سے متاثر ہوئی۔

"مجھے سخت پیاس لگی ہے۔ کیا مجھے پینے کے لیے پانی مل سکتا ہے؟" اس شخص نے پوچھا۔

"جی ہاں انکل۔ آپ اندر آجائیے۔" وہ شخص اندر داخل ہوا۔ لڑکی نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دوسرے دروازے سے اندر چلی گئی۔ اس شخص نے کرسی پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ چند پرانی کرسیاں۔ ایک بڑی سی میز اور دیوار کے ساتھ ایک پرانا دیوان۔ ابھی وہ کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ لڑکی اپنے ہاتھوں میں جگ اور گلاس لیے اندر داخل ہوئی۔ اس نے نہایت سلیقے سے گلاس میں شربت انڈیلا اور مہمان کو پیش کیا۔ شربت پینے کے بعد وہ آدمی اپنے اندر بڑی فرحت محسوس کرنے لگا تھا۔

"بیٹی تمہارا بہت بہت شکریہ" اس نے کہا۔

"شکریے کی کوئی بات نہیں انکل۔ یہ تو میرا فرض تھا۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" آدمی نے پوچھا۔

"میرا نام میری ہے اور میں قریبی قصبے کے اسکول میں چھٹی جماعت کی طالبہ ہوں۔" لڑکی نے بتایا۔

"ارے ہاں! یہ تو میں پوچھنا ہی بھول گیا۔ تمہارے امی ابا کہاں ہیں؟" مہمان کا سوال سُن کر میری کچھ اُداس ہو گئی۔ پھر اُس نے کہنا شروع کیا۔

"ابا کی طبیعت خراب ہے۔ امی ان کو ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئی ہیں۔ ابا کے پیٹ کا درد انھیں کئی مہینوں سے پریشان کر رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ اُنھیں میرے پاس شہر لے کر آنا۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ اس پتے پر ان کو ضرور لے کر آنا۔" اجنبی مہمان نے اپنی جیب سے اپنا وزٹنگ کارڈ نکال کر میری کو دیا۔ اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے شربت پلانے پر لڑکی کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ لڑکی نے اس کے دیے ہوئے کارڈ پر نگاہ ڈالی۔

ڈاکٹر ولیم براؤن

ایم ڈی ایم ایس۔ ایف آر سی ایس

کنگ ہاسپٹل۔ تھرڈ ایونیو۔ گرین اسکوائر

اچانک ڈاکٹر کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ لڑکی ان سے کچھ کہہ رہی تھی: "ڈاکٹر صاحب میرے ابا بہت بیمار ہیں۔ ہمارے قصبے کے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اگر ان کا آپریشن نہ کیا گیا تو وہ نہیں بچ سکتے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ ان کا علاج کریں گے۔

وہ باہر او پی ڈی میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی جتنی بھی فیس ہوگی وہ ہم ضرور ادا کر دیں گے۔ میرے ابا کو بچا لیں۔"

ڈاکٹر ولیم تیزی سے کھڑے ہوئے اور او پی ڈی کی طرف لپکے۔ میری بھی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ انہوں نے اس کے والد کا ابتدائی معائنہ کرتے ہی اندازہ لگا لیا کہ انھیں اپنڈکس ہے اور اگر فوراً آپریشن نہ کیا گیا تو اپنڈکس پھٹ جائے گا اور مریض کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ انہوں نے اپنے عملے کو آپریشن کی فوری تیاری کا حکم دیا۔

آپریشن تھیٹر سے جب ڈاکٹر ولیم باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ میری اپنی والدہ کے ساتھ ایک بنچ پر بیٹھی ہے وہ مسکراتے ہوئے اُن کے پاس پہنچے اور یہ خوشخبری سُنائی کہ آپریشن کامیاب رہا۔

اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں مسٹر بینجمن یعنی میری کے والد کا بہترین علاج ہوتا رہا۔ میری ہر روز ڈاکٹر ولیم سے پوچھتی کہ آپریشن اور اسپتال کے دوسرے اخراجات کا بل کتنا بنا ہے۔ اور یہ کہ اس کے ابا کو گھر جانے کی اجازت کب ملے گی۔ ڈاکٹر کے پاس میری کے تمام سوالوں کا ایک مسکراہٹ کے ساتھ یہی جواب ہوتا۔

"جس دن مسٹر بینجمن گھر جانے لگیں گے بل آپ کو مل جائے گا۔"

بالآخر ایک دن میری کے والد کو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ چلتے وقت ڈاکٹر ولیم میری کے پاس آئے اور اُسے ایک لفافہ دے کر کہا۔

"اس میں اسپتال کا بل ہے۔ اسے آپ گھر جا کر کھولیے گا۔" پھر وہ مسٹر بنجمن سے ملے اور انھیں چند ہدایات دے کر آگے بڑھ گئے۔

گھر پہنچ کر دھڑکتے دل کے ساتھ مسٹر بینجمن نے لفافہ کھولا وہ سوچ رہے تھے کہ اتنے بڑے اسپتال کا بل نہ جانے کتنا بنا ہو مگر بل پر نظر پڑتے ہی وہ چونک پڑے۔ پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

انہوں نے بل میری کی طرف بڑھا دیا۔ میری بل پڑھنے لگی۔

"" آپریشن کی فیس ۵۰۰۰ پونڈ

کمرے کا کرایہ ۲۰۰۰ پونڈ

دوائیں اور دیگر اخراجات ۳۰۰۰ پونڈ

کُل ۱۰۰۰۰ پونڈ

نوٹ :- بل کی پیشگی ادائیگی ۲۰ جون کو شربت کی شکل میں ہو چکی ہے۔""

میری کے تصور میں ڈاکٹر ولیم کی مہربان شخصیت گھوم گئی۔ اسے یاد آیا کہ بل کے بارے میں معلوم کرنے پر کس طرح وہ اُسے ٹال جاتے تھے۔ واقعی وہ انھیں مہمان نوازی اور خلوص کی صورت میں ان کی فیس تو ادا کر چکی تھی۔ میری کی آنکھوں میں ڈاکٹر ولیم کے لیے تشکر کے آنسو اُمڈ آئے۔ (مرکزی خیال ماخوذ)

Scandoo AFI-2/86

فنکار گلہری

شانی ایوب

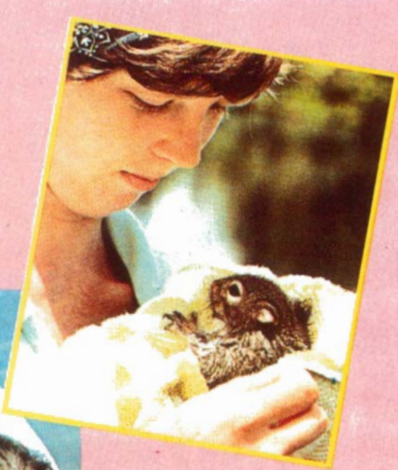

امریکی شہر سین فورڈ کے ایک باغیچے میں چک بیسٹ نام کا ایک شخص آنکھیں بند کیے بید کی کرسی پر بیٹھا نکھری دھوپ کا لطف لے رہا ہے یکایک باغیچے کے ایک کونے سے اس کے کانوں میں گلہری کی پریشانی بھری آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

"چِک چِک... چِک چِک... چِک چِک"

بیسٹ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر باغیچے کے اُس کونے پر نظر ڈالتا ہے جہاں سے یہ آوازیں آرہی ہیں۔ پھر وہ دھیرے سے اُٹھ کر باغیچے کے کونے کا رُخ کرتا ہے۔ باغیچے کے کونے میں گلہری کا ایک بچّہ سہما ہوا درخت کی اوٹ میں چھُپا ہوا ہے۔

"چیچ چیچ چیچ ۔۔۔ لگتا ہے یہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ہے۔۔۔ یا شاید اس کے ماں باپ ہی اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔" بیسٹ نے گلہری کے بچّے کو ہاتھوں میں اُٹھا کر افسوس کے ساتھ سوچا۔

بیسٹ کے ہاتھوں میں آتے ہی گلہری کے بچّے نے ایک مرتبہ پھر چِک چِک کا شور مچا دیا جیسے کہہ رہا ہو "پلیز مجھے پناہ دے دو۔ میں اکیلا ہوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" بیسٹ کے دل میں گلہری کے بچّے کے لیے محبت کے جذبات اُمڈ آئے اور اُس نے اُسی وقت اُس بچّے کو پالنے کا فیصلہ کر لیا۔ امریکہ میں انسانوں سے زیادہ جانوروں کے ساتھ محبت کی جاتی ہے۔ چنانچہ بیسٹ نے اپنے معاشرے کے عام رجحان کا پاس کیا۔ اُس دن سے آج تک گلہری اور بیسٹ کا ساتھ نہیں چھوٹا۔ بیسٹ نے گلہری کے اس بچّے کا نام ٹوِیگی رکھا۔

ایک دن بیسٹ اپنی بیٹی کے لیے ریموٹ کنٹرول طرز کی کشتی خرید کر لا رہا تھا کہ گلی میں بیٹھے ہوئے اُس کے دوستوں نے اُس کے ہاتھ میں بچّوں والی کشتی دیکھ کر مذاقاً کہا۔

"بیسٹ! یہ کشتی تم یقیناً اپنے لیے لائے ہو۔"

"نہیں اپنے لیے نہیں۔ اپنی گلہری کے لیے لایا ہوں۔ میں اس کی مدد سے اُسے واٹر اسکیٹنگ سکھاؤں گا۔"

بیسٹ نے دوستوں کے مذاق کو بھانپتے ہوئے جواباً مذاق کیا، لیکن بعد میں بیسٹ اپنے مذاق کے بارے میں سنجیدہ ہوگیا۔ یعنی اُس نے واقعتاً اپنی پالتو گلہری کو واٹر اسکیٹنگ سکھانی شروع کر دی۔

گلہریاں عام طور پر پانی سے بہت ڈرتی ہیں لیکن بیسٹ کی انتہائی شفقت کے باعث ٹوِیگی جلد ہی پانی سے مانوس ہوگئی۔ ٹوِیگی کو اسکیٹنگ کی تربیت دینے کے لیے بیسٹ نے تیرنے والا اسٹائرو فوم خریدا اور پھر اُس کو درمیان سے اس طرح کاٹا کہ وہ تختے نما پٹّوں میں تبدیل ہوگیا۔ اس کے بعد بیسٹ نے اُن پٹیوں کو ریموٹ کنٹرولڈ کشتی کے ساتھ باندھ دیا۔ اور پھر ٹوِیگی کی تربیت کا آغاز ہوگیا۔ تین ہفتوں کی تربیت کے بعد ٹوِیگی مشّاقی کے ساتھ واٹر اسکیٹنگ کرنے لگی۔

اِس وقت ٹوِیگی انیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اسکیٹنگ کر سکتی ہے۔ اسکیٹنگ کے دوران اگر کبھی ٹوِیگی پٹیوں سے پھسل کر پانی میں گر جاتی ہے تو بیسٹ فوراً کشتی روک دیتا ہے اور ٹوِیگی تیرتی ہوئی دوبارہ پٹیوں پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اسکیٹنگ کے ہر مظاہرے کے بعد بیسٹ ٹوِیگی کو ہمّت افزائی کے طور پر اُسے اچھا کھانا اور خوب خوب شاباش دیتا ہے۔ اب ٹوِیگی امریکہ کے مختلف حصّوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہتی ہے۔ اپنی حیرت انگیز فنکاری کے باعث ٹوِیگی پورے امریکہ میں مشہور ہوگئی ہے۔ ٹوِیگی کی بدولت اس کا مالک بھی امریکہ بھر میں مشہور ہوگیا ہے۔

آپ نے دیکھا! کبھی کبھی مذاق بھی کتنا فائدے مند ثابت ہوتا ہے!

محمد سلیم مغل

باعثِ توقیر

ڈبہ کھلتے ہی توقیر
کا بھرم کھل گیا اور . . . . .

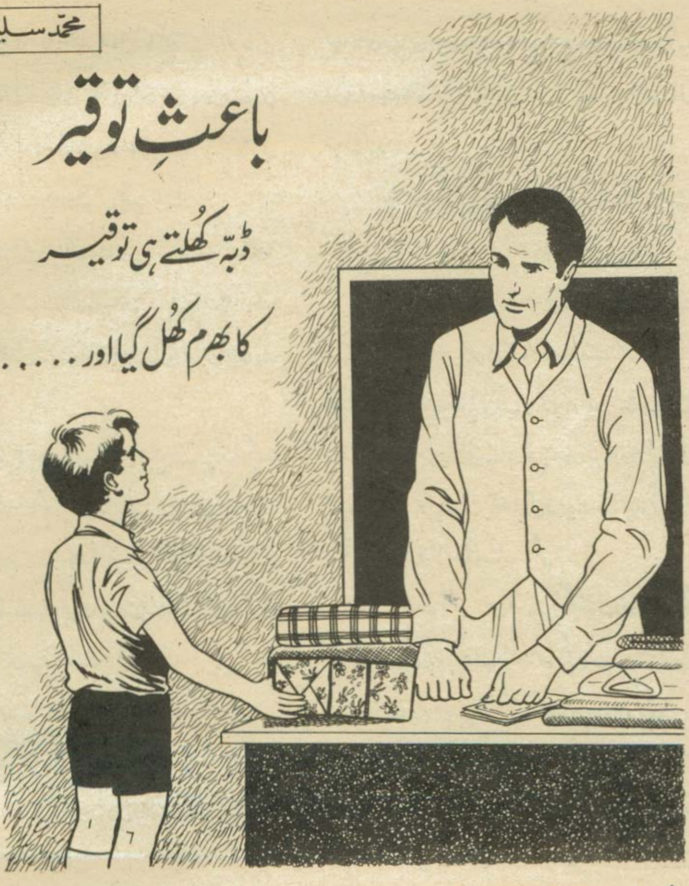

"ہاں بھئی عُذیر تم کیا لائے ہو؟"

"سر میں ایک سو روپے لے کر آیا ہوں۔"

"شاباش بیٹا شاباش ... اور عدیل تم کیا لائے ہو؟"

"سر میں بھی ایک سو روپے لایا ہوں۔"

"جیتے رہو۔ جیتے رہو..." ماسٹر صاحب ایک ایک بچّے کو بلاتے اور اُس سے رقم، کپڑے یا دوسرے عطیات لے کر میز پر رکھتے اور بچّوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اُن کو شاباش اور دعائیں بھی دیتے جاتے۔

گزشتہ روز ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسمبلی میں اعلان کیا تھا کہ "ملک بھر میں افریقہ کے قحط زدگان کے لیے فنڈز جمع کیے

جارہے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا اسکول بھی اس کارِ خیر میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ آپ لوگ بھی اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں اور نقد رقوم، کپڑے و دیگر عطیات دے کر اُن مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کریں جو محض بھوک اور افلاس کی وجہ سے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں"۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے حکومت کی طرف سے شائع کردہ ایک پوسٹر بھی نوٹس بورڈ پر آویزاں کروادیا تھا جس پر ایک ایسے بچّے کی تصویر چھپی ہوئی تھی جو غذائی کمی کے باعث ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا تھا۔ اس تصویر کو دیکھنے کے لیئے نوٹس بورڈ کے اطراف بچّوں کا ہجوم لگ گیا تھا۔ اور ہر وقت کھلے رہنے والے بچّوں کے چہرے اس پوسٹر کو دیکھ کر حیرت اور افسردگی کی تصویر بن گئے تھے۔

اس پوسٹر کا اثر تھا یا ہیڈ ماسٹر صاحب کی پُر تاثیر تقریر کا سحر کہ اگلے روز اسکول کا ہر بچّہ افریقہ کے قحط زدگان کے لیے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آیا بلکہ عطیات جمع کرنے کی اس مہم میں بچّے ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہوئے نظر آئے۔

ساتویں جماعت چونکہ اسکول کی سب سے بڑی کلاس تھی اس لیے اس کلاس میں عطیات بھی زیادہ جمع ہوئے۔ کلاس روم کی میز، کپڑوں، بسکٹ کے ڈبوں اور رنگ برنگے نوٹوں سے بھر گئی تھی... ماسٹر صاحب ایک ایک بچّے کو اپنے پاس بُلاتے اُس کے ہاتھ سے فنڈ کے لیے لائی گئی چیز یا رقم لے کر میز پر رکھتے اور اُسے شاباش دیتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر بیٹھنے کو کہتے۔ سب سے آخر میں ماسٹر صاحب نے توقیر کو آواز دی۔

"ہاں بھئی توقیر تم بھی آجاؤ... شاباش... جلدی، لاؤ کیا لائے ہو تم...؟"

توقیر جلدی جلدی اُٹھا اور ماسٹر صاحب کی طرف بڑھنے لگا، اُس کے ہاتھوں میں گتّے کا ایک ڈبہ تھا جس پر خوبصورت رنگوں والا ایک چمکتا ہوا کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ یہ ڈبہ بظاہر سب تحائف پہ بھاری نظر آرہا تھا اور کلاس کے دوسرے بچے دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ توقیر سب پر بازی لے گیا۔ یقیناً یہ کوئی قیمتی چیز لے کر آیا ہے۔

ماسٹر صاحب نے دُعائیں دیتے ہوئے وہ ڈبہ توقیر کے ہاتھ سے لے لیا اور میز پر رکھتے ہوئے پوچھنے لگے "کیا ہے اس ڈبے میں بیٹا؟"

توقیر ماسٹر صاحب کے اس سوال کے جواب میں خاموش رہا تو ماسٹر صاحب نے دوبارہ پوچھا "ارے بھئی کیا لائے ہو تم بتاتے کیوں نہیں...؟"

"سر! اباّجی کہتے ہیں۔ اپنی نیکیوں کو ظاہر نہ کیا کرو اس طرح نیکیاں ضائع ہوجاتی ہیں"۔ توقیر کے منہ سے یہ جواب سُن کر ماسٹر صاحب اُٹھے اور انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"شاباش بیٹا شاباش! تم نے جی خوش کر دیا۔ تمھارا یہ عمل یقیناً اللہ کو بھی پسند آئے گا... جیتے رہو، جیتے رہو" ماسٹر صاحب

دُعائیں دیتے رہے اور پھر پوری کلاس کو متوجہ کر کے اسی موضوع پر ایک لمبا سا لیکچر دے ڈالا۔ ماسٹر صاحب نے توقیر کی اس قدر تعریف کی کہ سب بچّے توقیر کو رشک کی نظر سے دیکھنے لگے اور دِل ہی دل میں اس سے مرعوب ہوتے چلے گئے۔ توقیر نے اپنے اس عمل سے ماسٹر صاحب اور کلاس کے بہت سے لڑکوں کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ مگر وہ خود اپنے اس عمل پر مطمئن نہیں تھا۔ کوئی بات تھی جو اُسے اندر سے بے چین کر رہی تھی اور وہ خوش ہونے کے بجائے اور بُجھ گیا تھا۔

یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ جو عطیہ آج توقیر لے کر آیا ہے وہ اتنا قیمتی نہیں ہے۔ جتنا کہ اس کے قیمتی ہونے کا تاثر اس کی خوبصورت پیکنگ سے دیا گیا تھا اور "نیکیوں کے ظاہر کرنے سے نیکیوں کے ضائع ہونے والا" جواب بھی دراصل ایک پردہ تھا۔ جس نے اس کے معمولی عطیئے کا بھرم رکھ لیا تھا۔

توقیر کے والد اسٹیٹ بینک میں چوکیدار کی حیثیت سے ملازم تھے۔ وہ انتہائی شریف آدمی تھے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے گھر کی کفالت کرتے، اپنی مالی پریشانیوں کے باوجود اُن کی زبان پر کبھی ناشکری کا کوئی لفظ یا اپنے رب سے شکوے کی کوئی بات زبان پر نہ آتی بلکہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے اور کم آمدنی کے باوجود رزقِ حلال پر قناعت کرتے۔ توقیر کے اماں ابّا خود تو تنگی میں گزر بسر کر لیتے مگر اُن کی خواہش ہوتی کہ وہ کسی طرح توقیر پر کوئی مشکل وقت نہ آنے دیں اور اُس کی ہر خواہش کو پورا کریں۔ مگر تنگدستی کے ساتھ کوئی اپنے بچّے کی خواہش کو کہاں تک پورا کر سکتا ہے۔ توقیر اُن کا اکلوتا بیٹا تھا، جو انھیں بے حد عزیز تھا۔ توقیر بھی اپنے ماں باپ کا فرمانبردار تھا۔ مگر ایک بات ایسی تھی جو توقیر کا روگ بن گئی تھی۔ اور وہ بات تھی اس کے والدین کی غربت۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا کہ اس کے والدین غریب کیوں ہیں، اُن کے پاس اچھا سا گھر کیوں نہیں ہے؟ اور عُذیر کے ابّو کی طرح ایک بڑی سی کار اُس کے ابّو کے پاس کیوں نہیں ہے۔ عدیل کے ابّو اُسے کار پہ چھوڑنے کیوں آتے ہیں۔ اُسے روزانہ دو میل پیدل چل کر اسکول کیوں جانا پڑتا ہے؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالات اُسے ہر وقت پریشان رکھتے۔ توقیر اکثر سوچا کرتا کہ اگر اسکول کے سب لڑکوں کی یونیفارم ایک سی نہ ہوتی تو اس کی غربت کا پول کب سے کُھل گیا ہوتا یا اُس کا گھر اسکول کے قریب ہوتا تب بھی اُس کے حالات اکثر لڑکوں پر عیاں ہو جاتے۔ اس کو یہ سوچ کر بڑی تسلّی ہوتی کہ اس کا گھر اسکول سے اور اسکول کے ساتھیوں کے گھروں سے بہت دُور ہے۔

اُسے اسکول کے بچّوں کی ایک سی یونیفارم اس لیے اچھی نہیں لگتی تھی کہ اُس میں بچّے ایک سے اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، بلکہ یونیفارم کو پسند کرنے کی واحد وجہ یہ تھی کہ اس طرح اُس کی غربت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔

ایک روز رمیز نے اُس سے کہا "یار تم پیدل کیوں آتے ہو، تمھارے ابّو تمھیں اپنی گاڑی میں اسکول نہیں چھوڑ سکتے کیا؟"

یہ سوال توقیر کے لیے کس قدر تکلیف دہ تھا اس کی شدّت صرف وہی جانتا تھا، مگر وہ بُجھے ہوئے دل سے کہہ دیتا۔ "یار ابّو کے دفتری اوقات مجھے سُوٹ نہیں کرتے۔ اور ویسے بھی اسکول کون سا دُور ہے مجھے تو پیدل چلنے میں مزہ آتا ہے۔"

توقیر کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا مگر کچھ عرصے سے اُس نے سچ کو اس طرح بولنا سیکھ لیا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہو وہ بھی سچ ہو اور جو دوسروں کو تاثر دینا چاہ رہا ہو وہ دراصل وہ نہ ہو جو یہ کہہ رہا ہے۔

ایک روز اس کے کلاس فیلو سجاد نے اس سے پوچھا کہ تمھارے ابّو کیا کرتے ہیں تو اُس نے اکڑ کر جواب دیا تھا کہ وہ اسٹیٹ بینک میں ہیں۔ سجاد بہت مرعوب ہُوا اور اسٹیٹ بینک کا بھاری بھرکم نام سُن کر اُسے یہ بھی پوچھنا یاد نہ رہا کہ وہ اسٹیٹ بینک میں کیا کرتے ہیں؟

اسکول میں جب کبھی عطیات جمع کرنے کی کوئی مُہم چلائی جاتی۔ توقیر وہی خوبصورت ڈبّے والا طریقہ استعمال کرتا اس طرح کسی کو یہ بھی پتا نہ چلتا کہ اس میں کیا ہے اور اس کی بڑائی کا بھرم بھی رہ جاتا۔ مگر اس بار کیا ہونے والا تھا۔ توقیر اس سے بے خبر تھا۔۔۔

بہت دنوں کے بعد اس بار اسکول میں تھر کے قحط زدگان کے لیے تحائف جمع کیے جا رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کلاس کے لڑکوں کو بتا رہے تھے کہ "صوبۂ سندھ کے ریگستانی خطّے میں بارشیں نہ ہونے کے باعث شدید قحط ہے۔ لوگ اور مویشی بھوک اور پیاس سے مَر رہے ہیں۔ اور ایسے میں ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی مدد کریں۔"

سب بچّے حسبِ استطاعت کچھ نہ کچھ لا رہے تھے۔ پیسے، کھلونے، بسکٹ کے ڈبّے، کپڑے اور۔۔۔ اور بھی بہت کچھ ان چیزوں سے کلاس روم کی بڑی سی میز بھر چکی تھی اور آخر میں ہمیشہ کی طرح توقیر ایک خوبصورت سا ڈبّہ لے کر جب ماسٹر صاحب کے قریب آیا تو انھوں نے شاباش شاباش، بیٹا شاباش، کہا اور ڈبّہ توقیر کے ہاتھ سے لے لیا، مگر پھر چند ہی لمحوں کے توقف کے بعد ماسٹر صاحب نے یہ کہتے ہوئے اس ڈبّے کو کھولنا شروع کر دیا کہ "توقیر بیٹا! ہمیں ہدایات ہیں کہ سامان کو ان ڈبّوں کی شکل میں نہ بھیجیں بلکہ انھیں کھول کر ایک بڑے سے بنڈل کی صورت میں باندھ کر بھجوائیں"۔ ماسٹر صاحب یہ کہتے جا رہے تھے اور ڈبّے کی سخت اور مضبوط پیکنگ کو کھولتے جا رہے تھے۔ پوری کلاس تجسس بھری نظروں سے ڈبّے کے کھلنے اور توقیر کے عطیے کو دیکھنے کے لیے بے چین تھی۔ اور توقیر پر تو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ وہ چاہ تو یہ رہا تھا کہ وہ یہ ڈبّہ ماسٹر صاحب کے ہاتھ سے لے کر بھاگ جائے۔ اور دوبارہ کبھی اس کلاس میں نہ آئے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اُسے پوری کلاس اپنی آنکھوں کے سامنے گھومتی نظر آئی۔ آنے والے لمحوں میں وہ جس شرمندگی سے گزرنے والا تھا اُسے اس کا احساس ہو چکا تھا۔ اور پھر ڈبّہ کھُل گیا۔ ڈبّہ کیا کھُلا جیسے بم پھٹ گیا ہو۔ ایک پھٹا پُرانا، بوسیدہ سا کپڑوں کا جوڑا جسے توقیر نے کم از کم سو بار تو پہنا ہی ہوگا اور جو کئی جگہوں سے اُدھڑنے کے بعد کئی بار سِل بھی چُکا تھا۔ "ایک خوبصورت ڈبّے سے ایک بوسیدہ جوڑا"!!!؟؟

پوری کلاس قہقہوں میں ڈوب گئی۔ طنزیہ نعرے۔ آوازیں۔ کوئی کہہ رہا تھا "دکھانے کے اور کھانے کے اور" کوئی کہہ رہا تھا "اونچی دکان پھیکا پکوان" کوئی توقیر کو حاتم طائی، حاتم طائی کہہ رہا تھا۔ لڑکوں کی ایک ٹولی "جعلی ہے جعلی ہے" کے نعرے لگانے لگی۔

توقیر اپنی جگہ پر مجسمے کی صورت مبہوت کھڑا تھا اور آنسوؤں کا نہ رُکنے والا ایک سلسلہ تھا جو اس کی آنکھوں سے جاری تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں کہیں دفن ہو جائے۔ مگر وہ ساکت جامد وہیں کھڑا رہا۔ ماسٹر صاحب سارے عطیات اُٹھا کر چل دیئے اور کلاس میں ہُلّڑ بازی اور شور و غوغا مزید بڑھ گیا۔

پھر توقیر کئی روز تک کلاس میں نہیں آیا اور اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں کلاس میں ہونے لگیں۔ جھوٹا ہے، منافق ہے، مکّار ہے۔ اور بھی نہ جانے کیا کیا کچھ۔ ایک دفعہ ماسٹر سردار اچانک توقیر کے گھر جا پہنچے۔ ماسٹر صاحب توقیر کے والد سے ملے۔ تو اُن پر یہ عقدہ کھلا کہ توقیر بہت غریب بچّہ ہے۔ اور کپڑوں کا جو جوڑا اُس نے عطیے میں دیا تھا وہ اُس کا سب سے بہتر اور قیمتی جوڑا تھا۔ توقیر اس کے علاوہ کچھ دیتا بھی تو کیا دیتا!

ماسٹر صاحب مسئلے کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک توقیر کے ابّو سے باتیں کرتے رہے اور پھر اجازت لے کر چل دیئے۔ اگلے روز جب ماسٹر صاحب کلاس روم میں پہنچے تو توقیر اُن کے ساتھ تھا، انہوں نے ایک کُرسی اپنی کرسی کے قریب رکھی اور توقیر کو اس پر بٹھا دیا۔ اب توقیر پوری کلاس کی نظروں کے سامنے تھا اور خود توقیر کی گردن جھکی ہوئی اور نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ کچھ لڑکوں کے چہروں پر شرارت کی لکیریں اُبھر رہی تھیں اور کلاس کے کسی کونے سے ہنسی کی پچکاریاں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔

ماسٹر صاحب نے پوری کلاس کو خاموش رہنے کی تلقین کی اور خود یوں گویا ہوئے۔

"رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں غزوۂ تبوک کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں، اس جنگ میں مسلمانوں کا مقابلہ قیصرِ روم سے ہونا تھا جو مال و دولت و افرادی قوت میں مسلمانوں سے کہیں آگے تھے۔

اتنی بڑی قوت سے ٹکر لینا اور اُسے شکست دینا بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نبئ کریمؐ نے مسلمانوں سے اس معرکے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کے لیے کہا... صحابہ کرامؓ نے بھی اپنے مال و متاع کو اس غزوہ کی تیاری میں لگا دیا تھا... حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اپنے مال و اسباب کا بڑا حصّہ لا کر دیا، حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے گھر کا آدھا سامان اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے گھر کا پورا سامان، فوجی تیاری کی اس مہم کے لیے پیش کر دیا۔ عورتوں نے اپنے زیور اور غریب صحابۂ کرامؓ نے اپنی مزدوری سے ہونے والی اُجرت اس مُہم کی نذر کر دی... ایک غریب صحابی کی قربانی کا واقعہ اس سلسلے میں اسلامی تاریخ کا ایک درخشاں باب بن گیا...

یہ وہ صحابی تھے جنہوں نے رات بھر مزدوری کر کے جو اُجرت پائی تھی اُس کے عوض حاصل ہونے والی چند کھجوریں خود نہ کھائیں بلکہ عطیے کے طور سے اس مہم میں لا کر دے دیں... بعض روایتوں میں ہے کہ بعض لوگوں نے اُن کے اس معمولی عطیے کا مذاق بھی اُڑایا مگر جب رسول اللہ کو معلوم ہُوا کہ اس عطیے کو کچھ لوگوں نے حقیر جانا ہے تو اُنہوں

نے نہ صرف ایسے مذاق کو ناپسند فرمایا بلکہ کھجوروں کے اس عطیے کو سب سے افضل قرار دیا اور فرمایا کہ یاد رکھو "عمل کا دارومدار نیت اور اس جذبے پر ہے جو اس عمل کے پیچھے کارفرما ہے"۔

اس واقعے کو سننے کے بعد ماسٹر صاحب نے پوری کلاس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "توقیر ایک غریب بچّہ ہے، اتنا غریب کہ شاید تمہارے پورے اسکول میں کوئی نہ ہو اور کپڑوں کا جو جوڑا اس نے عطیئے کے طور پر دیا تھا وہ اس کا سب سے قیمتی جوڑا تھا"۔ یہ کہتے کہتے ماسٹر صاحب کی آواز بھرّا گئی اور اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انھوں نے بھرّائی ہوئی مگر بلند آواز سے کہنا شروع کیا۔

"خدا کی قسم میرے نزدیک توقیر کی عزّت اُس شخص کی عزّت سے کم نہیں جس نے رسولِ اکرمؐ کی طرف سے جمع کیے جانے والے فنڈز میں چند کھجوریں دے کر سب سے اعلیٰ مقام حاصل کیا تھا"۔ یہ کہہ کر ماسٹر صاحب اُٹھے اور بے اختیار توقیر کا ماتھا چومنے لگے...

یہ منظر پوری کلاس کے لیے بڑا عجیب تھا۔ اکثر لڑکے خود اپنے اندر ایک عجیب تلاطم محسوس کر رہے تھے۔ شرارتی چہرے ایک بار پھر سنجیدہ ہو گئے تھے۔ اور توقیر کے احترام کا جو محل چند روز قبل مسمار ہو گیا تھا وہ ایک بار پھر دِلوں کی دُنیا میں جگمگا رہا تھا... ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے توقیر! تم صرف نام کے توقیر نہیں بلکہ ہم سب کے لیے باعثِ توقیر ہو"۔

توقیر اُٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک اور خبر نے پوری کلاس کو توقیر کا عقیدت مند بنا دیا۔

اخبار کے پہلے صفحے پر جلی حروف کے ساتھ ایک خبر اور بچّے کی تصویر شائع ہوئی تھی: "سانحہ اوجڑی کیمپ کے زخمیوں کی طبّی امداد کے لیے جہاں پوری قوم نے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور خون دینے والوں کی طویل قطاریں ہسپتال کے باہر دیکھنے میں آئیں وہیں ایک گیارہ سالہ بچّے نے ہسپتال کے پورے عملے کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

توقیر نامی اس بچّے کی شدید ضد کے باعث ڈاکٹرز کو مجبوراً زخمیوں کے لیے اس کا خون لینا پڑا۔ خون دینے والوں میں کم عمر خون دینے والے کی ایسی کوئی مثال اس سے پہلے نظر نہیں آئی"۔

سفرِ مبارک

معلوماتی بھی ــــــ رہنمائی بھی

حجّاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۲۰۳ صفحات

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے حاصل کر سکتے ہیں

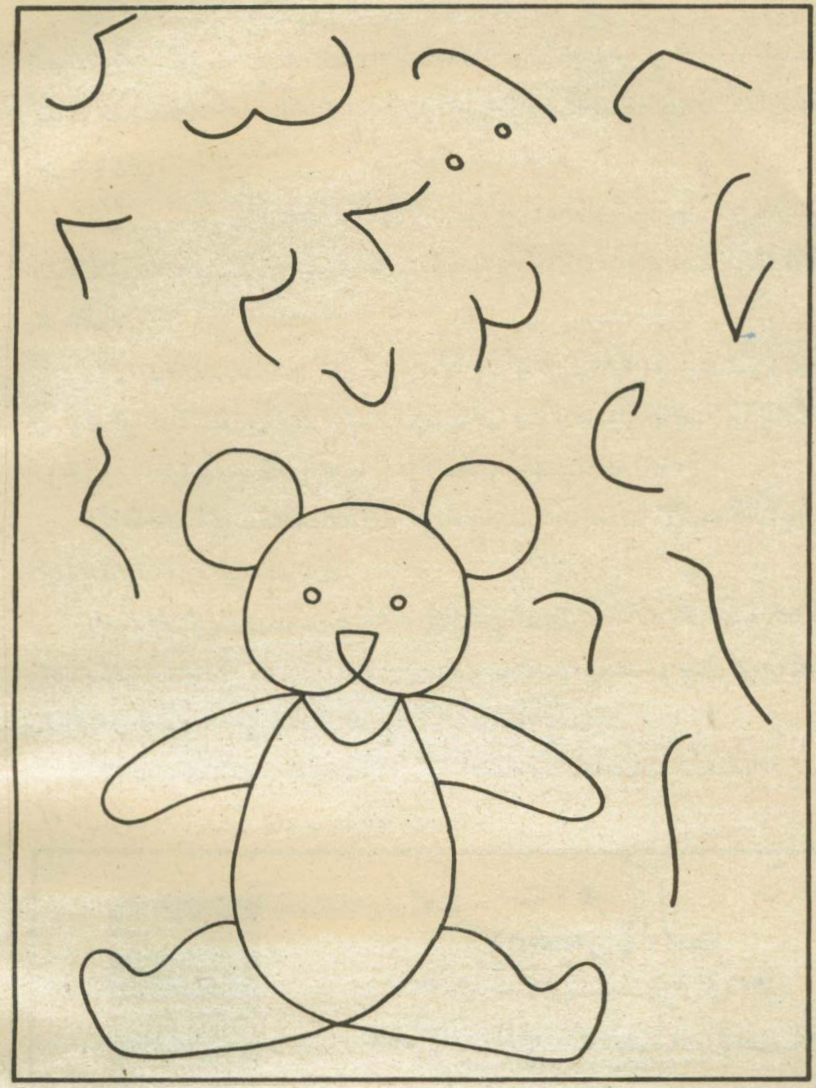

ان لکیروں کو آپس میں ملا کر دیکھیے تو سہی کہ کیا بنتا ہے ۔

یوں گزاری ہیں چھٹیاں ہم نے

تحسین فاطمہ

گرمی کا موسم دنیا بھر کے لیے ناپسندیدہ ہو سو ہو... ہمیں تو اس موسم سے پیار ہے، کہ یہ موسم ہر سال ہمارے لیے تین مہینے کی چھٹیوں کی سوغات لے کر آتا ہے۔ چھٹیاں آتی ہیں تو اُن کے ساتھ اور بھی بہت کچھ آتا ہے۔ لمبی لمبی مزیدار نیندیں آتی ہیں، سیر و تفریح کے دلچسپ مراحل آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اپنے اُن پیاروں سے ملنے کے مواقع آتے ہیں جو ہم سے دُور کسی دوسری جگہ پر آباد ہوتے ہیں۔

اس بار یہ چھٹیاں آئیں تو ہم نے ابّو سے ماموں کے ہاں لاہور چلنے کی فرمائش کی۔ ابّو نے فرمائش کو غور سے سنا اور بولے "پہلے گھر کا کام پھر سیر۔"

"مگر ابّو گھر کا کام تو امی کر لیتی ہیں" ہم نے جواب دیا۔

"ہوم ورک شریر لڑکی، ہوم ورک۔" ابّو نے پیار سے کان کے بینڈ بدلتے ہوئے کہا۔

"ابّو آپ ہی تو کہا کرتے ہیں کہ اللہ میاں فرماتے ہیں۔ میری زمین پر چلا پھرا کرو۔ چنانچہ پہلے ہم اللہ کا حکم مانیں گے۔ پھر اور کسی کا۔" ہم نے کان کی تکلیف کے زیرِ اثر دانش وری بگھاری۔ ابّو ہنس دیے۔

بہرحال ہم نے ابّو کا کہا مانا۔ دن رات ایک کیے اور ہوم ورک کا بڑا حصّہ پورا کیا۔ تب کہیں وہ دن آیا جب ہم لاہور کی

طرف محوِ سفر تھے۔

لاہور پہنچ کر سیر کے لیے ہمارا پہلا انتخاب مینارِ پاکستان تھا۔ سنگِ مرمر سے تراشا ہوا یہ تاریخی مینار دورانِ تفریح ہمیں بار بار قراردادِ پاکستان کی یاد دلاتا رہا۔ مینارِ پاکستان پر اُس دن بہت بھیڑ تھی۔ لوگوں کی بڑی تعداد کو دیکھ کر ہمارا دل بار بار وطن سے لوگوں کی والہانہ محبت پر اُنہیں داد دیتا رہا۔ البتہ وہاں پر بعض لوگوں کی اودھم بازی اور مینار پر چڑھ کر شہر کا نظارہ کرنا ہمیں اچھا نہیں لگا۔ اس مسئلے پر ماموں زاد بہن سے ہماری بحث ہوگئی۔ اس کا خیال تھا یہ تفریح کی جگہ ہے اسے جیسے جی چاہے برتو۔ جبکہ ہمارا کہنا تھا کہ یہ مقدس جگہ ہے، اِسے آگے بڑھ کر چوم لو۔ اس کی عظمت کو سلام کرو۔ ہماری بحث میں گرمی پیدا ہوئی تو ماموں کی آواز آئی کہ "جھگڑو مت، سیر کرو"۔ ہم خاموش ہوگئے کہ ہم سے بڑوں کا فیصلہ آگیا تھا۔

مینارِ پاکستان کے سامنے ہمیں بادشاہی مسجد کے مینار آسمان سے باتیں کرتے نظر آئے۔ قدم خود بخود ادھر اُٹھنے لگے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہماری خالہ نے کہا۔

"مسجد کو دیکھ کر مغلوں کی عظمت کا پتا چلتا ہے"۔

"معاف کیجیے گا خالہ جان! شاہی مسجد کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت کا پتا چلتا ہے"۔ ہم نے ایک مرتبہ پھر بحث کا دروازہ کھولا۔ ماموں نے ہمیں ترچھی نگاہوں سے دیکھا مگر ابو نے "بحث جاری رہے" کہہ کر ہمارا حوصلہ بڑھایا۔

مسجد کی سیر کر کے ہم اُس کمرے میں داخل ہوئے جہاں حضورؐ کا عمامہ مبارک، عصا مبارک اور دوسرے تبرکات رکھے تھے۔ دل چاہا ان کے اطراف موجود شیشے کی دیوار توڑ کر انھیں چوم کر آنکھوں سے لگا لیا جائے۔ ہم نے ابو سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا۔

"رسولِ پاکؐ سے محبت ہے تو آپؐ کی باتوں پر عمل کرو، عقیدت کے اظہار کا اس سے کامل طریقہ اور کوئی نہیں"۔ ابو کی بات میں وزن تھا۔

مسجد کو مکمل طور پر دیکھ لیا تو ہم نے مسجد کے احاطے میں دفن اپنے پیارے شاعر علامہ اقبالؒ کے مزار کا رُخ کیا۔

فاتحہ پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ ہماری خالہ زاد بہن نے فرمایا۔

"اللہ... اتنا بڑا شاعر اور اتنا چھوٹا سا مزار۔ اِسے اور کہیں کھُلی سی جگہ پر ہونا چاہیئے تھا"۔

"کیوں... مسجد کے سائے میں کیا بُرائی ہے؟ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ علامہ کو اللہ اُس کے رسولؐ اور قرآن سے کتنی محبت تھی"۔ ہم نے انھیں گھورتے ہوئے کہا۔ اس مرحلے پر ابو نے مصالحتی کردار ادا کرتے ہوئے کہا کہ "بھئی اقبال کا اصل مقام تو لوگوں کے دلوں میں ہے، وہ تو زندگی میں بھی مرمر کی سلوں، افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں سے بیزار تھے"۔

اب شام ہو چکی تھی اس لیے ہم سب نے گھر کا رُخ کیا اگلے دو روز تک کہیں جانے کی ہمت نہ ہوسکی۔ اس لیے دو

روز آرام کے بعد ہم نے چڑیا گھر کو عزّت بخشی ۔

چڑیا گھر میں مختلف جانوروں کو دیکھتے ہوئے شیر کے پنجرے کے سامنے پہنچے تو ہمارے چھوٹے بھائی نے نعرہ لگانا شروع کر دیا "شیر لوں گا ۔ ۔ ۔ شیر لوں گا"۔ ہم سب اُس کی معصومیت پر ہنس دیے ۔ ہم ہر معصوم چیز پر کیوں ہنس دیتے ہیں ؟ چڑیا گھر دیکھتے ہوئے ماموں جان نے ارشاد کیا کہ یہ سب درندے انسانی عقل کے سامنے بے بس ہیں ۔ ہم نے اُن جانوروں کو جنگل کی آزاد فضا سے دور لا کر رکھنے کو ظلم قرار دیا تو ماموں جان نے میری تائید کی اور بتایا کہ اب ایسے چڑیا گھر بن رہے ہیں جہاں ان جانوروں کے لیے قدرتی ماحول پیدا کیا جاتا ہے ۔

لاہور کے تمام قابلِ دید مقامات کی سیر کرتے کرتے ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا ۔ اس کے بعد ہم نے ماموں کے ہاں ایک ہفتہ اور قیام کیا ۔ اس ایک ہفتے کے دوران ماموں کا گھر ہماری وجہ سے کبھی جلسہ گاہ، کبھی مشاعرے اور کبھی میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرتا رہا ۔ لیکن روز شام ڈھلے ہر سرح کی سرگرمی ختم ہو جاتی اور ہم اپنے تمام ماموں زادیوں اور خالہ زادیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور پھر اُن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سونے کے کمرے کا رُخ کرتے ۔

بالآخر وہ دن آیا جب ہم اپنے گھر واپسی کے لیے چل پڑے ۔ گھر پہنچے تو بخار نے آ لیا کئی روز بخار میں گزرے ۔ اس کے بعد جو دن باقی بچے اُن میں ہم نے اپنا ہوم ورک مکمل کیا ۔ ۔ ۔ چند روز بعد جب ہم خالی و مانع یعنی "شیطان کا گھر" کے زیرِ اثر خوب ہنگامہ برپا کیے ہوئے تھے کہ ابّو نے سب بہن بھائیوں کو جمع کر کے ایک عدد نصیحت بھری تقریر کر ڈالی جس کے اہم نکات یہ تھے ۔

"۱ ۔ مل جُل کر رہو ۔

۲ ۔ ٹائم ٹیبل بناؤ ۔

۳ ۔ پانچ وقت کی نماز پڑھو"

آج کل ہم ان نکات کو گرہ سے باندھ کر اپنے شب و روز گزار رہے ہیں ۔

نتیجہ مقابلۂ مضمون نویسی

اگست کے شمارے میں "آنکھ مچولی" نے اپنے قارئین طلبہ و طالبات کے درمیان ایک مقابلۂ مضمون نویسی بہ عنوان "یوں گزاری ہیں چھٹیاں میں نے" منعقد کیا تھا ۔ مقابلہ کی آخری تاریخ تک ہمیں اس سلسلے میں سینکڑوں مضامین موصول ہوئے ۔ جج صاحبان کے فیصلہ کے مطابق لاہور کی تحسین فاطمہ کا مضمون اوّل انعام کا مستحق قرار پایا ہے ۔ تحسین فاطمہ کو مبارک باد کے ساتھ اعلان کے مطابق ایک عدد خوبصورت قیمتی تحفہ ارسال کیا جا رہا ہے ۔ اس سلسلے کے چند قابلِ اشاعت مضامین آئندہ وقتاً فوقتاً شائع کیے جائیں گے ۔

آپ کتنے پانی میں ہیں۔ ابھی معلوم ہو جاتا ہے

کہیں آپ شیخی خورے تو نہیں

حارث شمیم

دنیا میں شیخی خوروں کی کوئی کمی نہیں۔ اسی لیے ہمیں اُمید ہے کہ آپ کے گھر یا آپ کے مِلنے جُلنے والوں میں ایک آدھ شیخی خور ضرور موجود ہوگا، بلکہ ممکن ہے آپ ۔۔۔ خیر چھوڑیے کہیں آپ بُرا نہ مان جائیں۔ شیخی خوری کی عادت کے برخلاف ایک اور عادت ہوتی ہے محتاط گفتگو کی، ہر چیز کا تجزیہ کر کے فیصلہ کرنے کی، یہ نہایت اچھی عادت ہے۔ شاید اسی لیے کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں میں یہ عادتیں نمایاں ہوتی ہیں اور بعض "چھپے رُستم" ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کو تو یہی معلوم نہیں ہوتا کہ اُن کا شمار کس قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ہم ایک دلچسپ ٹیسٹ پیش کر رہے ہیں۔ ٹیسٹ میں بارہ سوالوں کے جواب دے کر آپ خود اپنی شخصیت کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ ان بارہ سوالات میں سے ہر ایک سوال کے پانچ مختلف جوابات ممکن ہیں اور ان میں سے ہر جواب کے علیحدہ نمبر ہیں۔ مثال کے طور پر :-

- اگر کسی سوال کا جواب آپ کے نزدیک فوراً "ہاں" ہے۔ تو اس کے پانچ نمبر ہوں گے۔
- لیکن اگر آپ نہیں کے بجائے سوچ کر "ہاں" کہتے ہیں تو اس کے چار نمبر ہوں گے۔

- "اِس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے" تو اس کے تین نمبر ہوں گے۔
- اسی طرح اگر کسی سوال کے جواب میں آپ تھوڑی دیر میں "ہاں" کہنے کے بجائے "نہیں" کہتے ہیں تو اس کے دو نمبر ہوں گے۔
- جبکہ واضح طور پر "نہیں" کا ایک نمبر ہوگا۔

سوالات یہ ہیں:-

(١) کیا آپ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ٹرین کی چھت پر سوار ہو کر سفر کرنا پسند کریں گے ؟

(٢) اگر آپ کو کچھ لوگوں کے ساتھ سرد پانی والی نہر پار کرنی ہو تو کیا آپ نہر پار کرنے میں پہل کریں گے ؟

(٣) اگر شیر کے پنجرے کا نگراں آپ کو یقین دلائے کہ شیر کی موجودگی کے باوجود پنجرے میں داخل ہونا خطرناک نہیں ہے، تو کیا آپ پنجرے میں داخل ہونا پسند کریں گے ؟

(٤) کیا آپ کسی انجن والی تیز رفتار کشتی کو سیکھے بغیر چلانا پسند کریں گے ؟

(٥) کیا آپ کسی بھاگے ہوئے سرکش گھوڑے کو پکڑ کر لانا پسند کریں گے ؟

(٦) کیا آپ کسی فیکٹری کی چمنی پر کسی ماہر کی نگرانی میں چڑھنا پسند کریں گے ؟

(٧) کیا آپ کسی اپنے ایسے دوست کے ساتھ کار میں سفر کرنا پسند کریں گے جس نے حال ہی میں کوئی بڑا ایکسیڈنٹ کیا ہو؟

(٨) اگر چار افراد ایک چادر کو چاروں کونوں سے پکڑ کر اُسے زمین سے اُوپر اُٹھائے کھڑے ہوں تو کیا آپ دس میٹر کی بلندی سے اُس چادر پر چھلانگ لگا دیں گے ؟

(٩) کیا آپ کسی سنگین بیماری سے نجات پانے کے لیے ایسا آپریشن کروانا پسند کریں گے، جس میں جان جانے کا خطرہ ہو ؟

(١٠) اگر کوئی لفٹ چھ آدمیوں کا وزن اُٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہو اور اس میں پہلے سے سات افراد سوار ہوں تو کیا آپ اُس لفٹ میں سوار ہونا پسند کریں گے ؟ جب کہ آپ کو جلدی ہے ؟

(١١) اگر آپ کا ٹیچر آپ کو یقین دلائے کہ ہائی وولٹیج تار میں کرنٹ موجود نہیں ہے تو کیا آپ تار کو ہاتھ لگانا پسند کریں گے ؟

(١٢) کیا آپ چند ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد ہیلی کاپٹر اُڑانے کے لیے تیار ہو جائیں گے ؟

تمام سوالات کے نمبروں کو جوڑ کر دیکھ لیجیے۔ اگر آپ کے کُل نمبروں کی تعداد ۵۰ یا اس سے زیادہ ہے تو آپ یقیناً شیخی خورے یا جلد باز واقع ہوئے ہیں اور اگر آپ کے کُل نمبر ۲۵ یا اس سے کم ہیں تو آپ حقیقت پسند اور محتاط شخصیت کے مالک ہیں۔

خط کی کارستانی

مکان خالی کروانے کا انوکھا طریقہ

ذیشان ہاشمی

صبح ہوئی اور اکرام صاحب کے گھر سے حسبِ معمول لڑائی جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں۔ اکرام صاحب دراصل ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ جہاں وہ کلرک کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں بیوی چار سال قبل اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔ اکرام صاحب کا مکان دومنزلہ تھا۔ نیچے کی منزل میں وہ خود رہتے تھے اور ڈیڑھ سال قبل اُوپر کی منزل اُنھوں نے کرائے پر اُٹھا رکھی تھی۔ ایک سال تک تو جبّار صاحب کرایہ صحیح طور پر ادا کرتے رہے۔ مگر سال پورا ہوتے ہی وہ کرایہ دینے میں ٹال مٹول کرنے لگے۔ اور اب تو انھوں نے کرایہ ادا کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بے اکرام صاحب تو وہ ایک شریف آدمی تھے۔ اُن میں نہ اتنی ہمت تھی اور نہ اتنے پیسے کہ عدالت میں مقدمہ دائر کرتے۔ کیوں کہ تمام جمع پونجی وہ اپنے مکان پر لگا چکے تھے۔ اور گھر کا خرچ مکان کے کرائے اور تنخواہ سے چلتا تھا۔ اب مکان کا کرایہ آنا بند ہوا تو اکرام صاحب شدید مالی مشکلات میں مبتلا ہوگئے۔ انھوں نے جب کرائے کا تقاضا کرنا شروع کیا تو بات بڑھنے لگی۔ روز روز جھگڑے ہونے لگے۔ آج صبح کا جھگڑا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

عدنان ایک عقل مند اور ہوشیار لڑکا تھا اور اس کا مکان اکرام صاحب کے پڑوس ہی میں واقع تھا۔ جب عدنان

کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اسے اکرام صاحب سے ہمدردی ہوگئی۔ وہ اکرام صاحب کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ وہ کام اکیلے نہیں، بلکہ اپنے دوستوں فرحان اور ساجد کے ساتھ مل کر انجام دینا چاہتا تھا۔

ڈرائنگ روم میں تین لڑکے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ "یار فرحان! ہمیں اکرام صاحب کی مدد کرنی چاہیے۔" عدنان نے فرحان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اکرام صاحب کو ہماری مدد کی سخت ضرورت ہے۔ ویسے بھی ان کا کوئی لڑکا تو ہے نہیں۔" ساجد نے عدنان کی تائید کی۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔" فرحان نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"کیا واقعی!" عدنان نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں بابا، تم لوگ سنجیدہ ہو تو بتاؤں۔" فرحان نے بے زاری کے عالم میں کہا۔

"اچھا بھائی! لو ہم نے اپنے ہونٹ بہت ہی موٹے دھاگے سے سی لیے۔" عدنان نے کہا۔

"ہم تینوں مل کر اکرام صاحب کے بھتیجے کی طرف سے ایک فرضی خط بھیجیں گے۔ جسے ساجد کو پوسٹ مین بن کر جبار صاحب کے لیٹر بکس میں ڈالنا ہوگا۔ اور یہ بھتیجا پولیس انسپکٹر ہوگا۔" فرحان نے اپنی بات مکمل کی۔

"بات کچھ دل کو لگتی ہے۔" عدنان نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"لیکن سب چیزوں کا انتظام کہاں سے ہوگا؟ سائیکل، پوسٹ مین کی وردی، بہت سارے جعلی خط، تھیلا وغیرہ۔" ساجد جو بہت دیر سے خاموش تھا، جواب طلب انداز میں بولا۔

"خط میں لکھوں گا، پوسٹ مین کی وردی اور تھیلے کا انتظام فرحان کرے گا اور خط تم ڈالو گے۔" عدنان نے ساجد کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"واہ واہ! صاحب جی نے خود تو بڑا آسان کام لے لیا اور ہمیں سب سے مشکل کام میں پھنسا دیا۔ اگر کسی نے خط ڈالتے ہوئے مجھ جعلی ڈاکیے کو پکڑ لیا تو میں تو بے موت مارا جاؤں گا۔" ساجد نے معصوم بچے کی طرح کہا۔ اور آخرکار یہ طے پاگیا کہ خط عدنان لکھے گا، پوسٹ مین کی وردی اور سائیکل کا انتظام فرحان کرے گا۔ اور خط ساجد کو ڈالنا ہوگا۔ اس کے بعد تینوں اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

اگلی صبح ساجد پوسٹ مین کی وردی میں ملبوس، سائیکل پر سوار، جس کے آگے خطوں سے بھرا ایک تھیلا لٹکا تھا۔ اکرام صاحب کی گلی میں داخل ہوا۔ اکرام صاحب کے مکان پہ رُک کر ساجد نے تھیلے میں سے ایک لفافہ نکالا۔ اس وقت گھر میں اتفاق سے نہ اکرام صاحب تھے اور نہ جبار صاحب۔ یوں ساجد کا کام اور آسان ہوگیا۔ اُس نے اُوپر والی منزل میں دروازے

کے نیچے سے خط اندر ڈالا اور گھنٹی بجاکر نو دو گیارہ ہوگیا۔ گھنٹی کی آواز سُن کر جبّار کی بیوی دروازے کے پاس آئی تو اُسے اکرام صاحب کے نام کا خط نظر آیا۔ وہ خط بجائے اکرام صاحب کو دینے کے اندر لے آئی اور چونکہ وہ اس غلط کام میں جبّار صاحب کے ساتھ برابر کی شریک تھی، لہٰذا اُسے اپنی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا۔ اور پھر جو لوگ غلط کام کرتے ہیں، اُن کے دلوں میں طرح طرح کے خدشے سر اُبھارتے ہیں ہیں۔ اسی خیال سے مسز جبّار یعنی ثریّا نے خط پھاڑ لیا کہ ہوسکتا ہے' اس خط میں کوئی خاص بات ہو۔ لیکن جیسے جیسے وہ خط میں لکھے ہوئے الفاظ پڑھتی گئی اس کے چہرے کا رنگ کسی گرگٹ کی طرح بدلتا گیا۔ خط پڑھ کر وہ بے چینی سے جبّار کا انتظار کرنے لگی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جبّار صاحب گھر آئے تو ثریّا نے خط ان کی جانب بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" جبّار صاحب نے اپنی بیوی سے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"آپ خود پڑھ کر دیکھ لیں"۔ ثریّا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

جبّار صاحب خط کے لفافے پر اکرام صاحب کا نام دیکھ چکے تھے، مگر پھر بھی انھوں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ خط پڑھنے کے دوران ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا، دوسرا جاتا۔ خط کے الفاظ کچھ یوں تھے۔

پیارے چچا جان ... آداب!

میں یہاں خیریت سے ہوں اور آپ سب کی خیریت خداوند تعالیٰ سے نیک مطلوب ہے۔ آپ کو یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوگی کہ میری پوسٹنگ آپ کے علاقے میں ہوگئی ہے اور میرا عہدہ بھی پہلے سے بڑھ گیا ہے۔

آپ نے اپنے خط میں جو مکان کا مسئلہ بھیجا تھا، وہ تو بہت چھوٹا ہے، میں نے تو بڑے بڑے مجرم سیدھے کر دیے ہیں۔ آپ کا کام تو میں کسی کو بھی بھیج کر کروا سکتا ہوں لیکن اب چونکہ میری پوسٹنگ آپ کے علاقے میں ہونے والی ہے، اس لیے آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کے کرائے دار کو منٹوں میں سیدھا کر دُوں گا۔ باقی سب خیریت ہے۔ دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ خدا حافظ۔

آپ کا بھتیجا، اظہر لطیف

خط ختم ہوا تو جبّار صاحب کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اور ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اسی کپکپاہٹ میں خط اُن کے ہاتھوں سے نکل کر نیچے جا پڑا۔ جبّار صاحب بے چینی سے ٹہلنے لگے، جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہ رہے ہوں۔

علی الصبح جب مؤذّن اذان کی تیاری کر رہا تھا، سامان سے لدا پھندا ایک ٹرک اکرام صاحب کے گھر کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ کچھ دیر میں جبّار صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ ٹرک میں سوار ہوگئے اور ٹرک تیز رفتاری سے آگے روانہ ہوگیا۔ ٹرک کو یوں تیزی سے جاتے دیکھ کر دُور جھاڑیوں میں چھپے تین سلئے قہقہے لگانے لگے۔

ایک انوکھی تصویر

محسن احسان

بھیّا نے تصویر بنائی   باجی سے جب ہوئی لڑائی
ناک گلہری جیسی تھی   شکل نیولے سے ملتی تھی
آنکھیں ملتی تھیں بندر سے   خالی خالی تھیں اندر سے
خرگوشوں سے کان کھڑے تھے   پاؤں ہاتھی سے ملتے تھے
اُلّو کی پہچان تھی اس میں   گیدڑ کی کچھ شان تھی اس میں
مینڈک جیسی کھال تھی اس کی   بطخوں جیسی چال تھی اس کی
تھوڑی تھوڑی شکل بنی تھی   بلّی، بکری اور، ہرن کی!
سر پہ جوتا پاؤں میں تھالی   یہ تھی اِک تصویر نرالی

بھیّا نے تصویر دکھائی
باجی نے کی پھر نہ لڑائی

اخلاق احمد

آپریشن قلفی

حق اسکواڈ کی نئی مہم

ایک بُرائی کو ذہانت سے ختم کرنے کی داستان

"قلفی" سرفراز نے سر جھٹک کر کہا "قلفی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔"

سامنے بیٹھے شہریار، ضیأ اور شہزاد نے اُسے یوں دیکھا جیسے پنجرے میں بند کسی جانور کو چڑیا گھر کی سیر کرنے والے دیکھتے ہیں۔

شہریار نے کہا "سرفراز۔ یہ قلفی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کیسے بن گئی؟"

ضیأ بولا۔ "ہم تو سمجھتے تھے کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ غربت یا جہالت ہے۔"

شہزاد نے کہا "اور میں سمجھتا تھا کہ رشوت ہمارا عظیم ترین مسئلہ ہے۔"

شہریار بولا۔ "میرا خیال تھا کہ اسلام سے دوری ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مگر بھائی سرفراز کے اس حیرت انگیز انکشاف

کے بعد سے میں پریشان بیٹھا ہوں کہ قلفی... ٹھنڈی میٹھی قلفی... مزیدار قلفی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کیسے ہو سکتی ہے؟"

سرفراز مُسکرایا۔" بے وقوف لوگوں کو دوست بنانے کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ کام کی بات نہیں سمجھتے۔ بلکہ کوئی بات نہیں سمجھتے بھائی، میں نے یہ نہیں کہا کہ قلفی ہمارا قومی مسئلہ ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ قلفی ہمارا، یعنی ہم لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ پوچھو کیسے؟"

"کیسے؟" سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"وہ ایسے کہ آج کل ایک گاڑی ہمارے علاقے میں گھوم گھوم کر قلفی فروخت کر رہی ہے۔ تم لوگوں نے بھی شاید دیکھی ہو۔ سُرخ رنگ کی سوزوکی پک اپ ہے وہ اور اس میں نصب ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے ہر وقت موسیقی نشر ہوتی رہتی ہے۔"

"اچھا اچھا" شہزاد نے کہا۔" وہ گاڑی تو میں نے بھی دیکھی ہے۔"

سرفراز بولا" ایک ایک روپے کی قلفی دیتے ہیں وہ۔ گاڑی چلتی جاتی ہے، موسیقی بجتی جاتی ہے اور بچے گھروں سے بھاگ بھاگ کر باہر نکلتے آتے ہیں۔"

"قبلہ سرفراز صاحب" شہریار نے کہا" آپ کو کس بات پر اعتراض ہے۔ موسیقی بجنے پر یا گاڑی کے چلنے پر؟"

سرفراز نے کہا" مجھے قلفی پر اعتراض ہے۔"

"کیسا اعتراض؟" ضیاء نے پوچھا۔

"وہ قلفی نہیں ہوتی' برف ہوتی ہے۔ نری برف۔ جس میں ذراسی خوشبو اور چند قطرے دودھ شامل کر دیے گئے ہیں۔ کل میں نے وہ قلفی پہلی بار چکھی تو مجھے احساس ہوا کہ اس قسم کی فضول قلفی تو کسی کی صحت کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ چھوٹے بچوں کے لیے تو خاص طور پر ایسی قلفی بڑی نقصان دہ ہے اور چھوٹے بچے ہی اس قلفی کے سب سے بڑے خریدار ہیں۔"

"یہ تو واقعی خطرناک بات ہے" شہریار نے کہا۔

"ایسی قلفی کی فروخت تو بند کر دینی چاہیے" ضیاء بولا۔

شہزاد نے کہا" ہاں کم از کم اپنے علاقے میں تو ایسی قلفی ہرگز نہیں بکنی چاہیئے۔"

شہریار اُٹھ کھڑا ہوا" ٹھیک ہے" اس نے کہا" حق اسکواڈ قلفی والے سے نمٹ لے گا۔"

قلفی فروخت کرنے والے کا نام یعقوب تھا۔ وہ بے تحاشا موٹا اور ہر طرف سے گول شخص تھا۔ وہ سوزوکی چلاتا تھا اور قلفی خریدنے والے بچوں سے پیسے وصول کرتا تھا۔

سوزوکی کے پچھلے حصے میں رکھے ہوئے برف کے ڈبے میں سے قلفیاں نکال نکال کر دینے کا کام یعقوب کے دو ساتھی

کلیم اور سلام کرتے تھے۔ یعقوب جس قدر موٹا تھا، کلیم اور سلام اسی قدر دُبلے پتلے تھے۔

یعقوب کا کاروبار خوب چمک رہا تھا۔ اس کی وجہ یعقوب کی ذہانت تھی۔ وہ کسی بھی علاقے میں ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک قلفیاں فروخت نہیں کرتا تھا۔ جب لوگ اُسے اور اس کی قلفیوں کو بُرا بھلا کہنے لگتے تو وہ شہر کے کسی دوسرے علاقے میں قلفیاں فروخت کرنے لگتا۔ دس پیسے کی قلفی ایک روپے میں فروخت ہوتی تھی اور دن بھر میں بے شمار بچے قلفیاں خرید کرتے جاتے تھے۔

اس علاقے میں اس نے ابھی چند دن قبل ہی قلفیاں فروخت کرنی شروع کی تھیں۔

اس روز وہ حسبِ معمول سوزوکی سست رفتاری سے چلا رہا تھا کہ اچانک کسی گلی میں سے چار لڑکے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ کے اشارے پر یعقوب نے گاڑی روک لی۔

"جی۔ باؤجی" یعقوب نے پوچھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ چاروں لڑکے حق اسکواڈ کے ارکان ہیں۔

"چار قلفیاں چاہئیں" سرفراز نے سر کھجا کر کہا "میٹھی، اچھی، ٹھنڈی، مزیدار اور شاندار قلفیاں"

"چار روپے" یعقوب نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ پھیلایا۔

شہریار نے چار روپے اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا "قلفیاں اچھی نہیں ہوئیں تو ہم یہ پیسے واپس لے لیں گے"

"قلفیاں بہترین ہیں باؤجی" یعقوب نے مُسکرا کر کہا۔ پھر اس نے مڑ کر کہا "اوئے کلیم، اوئے سلام۔ باؤ لوگوں کو چار قلفیاں دو"

قلفیاں لے کر انھوں نے بیک وقت اُنہیں دیکھا۔

"یہ کیا ہے بھئی؟" ضیا نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"یہ تو بدذائقہ قلفیاں ہیں" شہزاد بولا۔

"قلفیاں تو یہ ہیں ہی نہیں۔ یہ تو نِری برف ہے" سرفراز نے کہا۔

"ہاں بھئی" شہریار نے قلفی پھینک کر ہاتھ جھاڑ کر کہا "پیسے واپس کرو"

ایک لمحے کے لیے تو یعقوب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پہلے اُسے یوں لگا جیسے وہ لوگ مذاق کر رہے ہیں۔ مگر پھر اُسے احساس ہوا کہ بات سنجیدگی سے کہی گئی ہے۔

"کیا مطلب؟" اس نے پوچھا "قلفیاں بیچنے کے بعد واپس تو نہیں لی جاتیں نا باؤجی"

"تو پھر ایسی قلفیاں بیچی ہی کیوں جاتی ہیں؟" سرفراز نے کہا۔

"کون ہو بھئی تم لوگ؟" یعقوب کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔

"حق اسکواڈ" شہزاد نے کہا "سمجھتے ہو حق اسکواڈ کا مطلب؟"

"کیا ؟" یعقوب گڑبڑا گیا۔

"نہیں سمجھتے تو سمجھ جاؤ گے" ضیاء ہنسا "بڑے بڑوں کی سمجھ میں چٹکی بجاتے آگیا ہے۔ تم تو محض ایک گول سے موٹے سے، ڈھول جیسے قلفی والے ہو، جلد ہی سمجھ جاؤ گے"۔

"چلے جاؤ اوئے" یعقوب گلا پھاڑ کر چلایا "میری نظروں سے دور ہو جاؤ"۔

"ہماری بات سن لو مسٹر قلفی والے" شہریار نے کہا "آئندہ اگر تم اس طرف نظر آئے تو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہو گا"۔

وہ چاروں ایک ساتھ مڑے اور تیزی سے اسی گلی میں غائب ہو گئے جس میں سے نمودار ہوئے تھے۔ یعقوب تھوڑی دیر تک تو خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر کہا "ہونہہ۔ ہاتھ برابر کے لونڈے ہیں اور دھمکیاں ایسے دیتے ہیں جیسے مجھے توپ کے منہ پر باندھ کر توپ چلا دیں گے"۔

اگلے روز مقررہ وقت پر یعقوب کی گاڑی اسی علاقے میں داخل ہوئی۔

موسیقی بجاتی گاڑی کی آواز سنتے ہی بچے گھروں سے نکل نکل کر آنے لگے۔ یعقوب ایک گلی کے کونے پر گاڑی روکنے والا ہی تھا کہ اسے اپنی گاڑی میں گڑبڑ کا احساس ہوا۔ ایک طرف ذرا سی جھک جانے والی گاڑی ذرا سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ چل رہی تھی۔

یعقوب نے اتر کر دیکھا۔

ایک پہیہ پنکچر ہو چکا تھا۔ اس کی ہوا نکل چکی تھی۔

یعقوب کے پاس ایک فاضل پہیہ تھا۔ اس نے اپنے دبلے ساتھیوں کو آواز دی "اوئے سلام، اوئے کلیم۔ نیچے اترو۔ پہیہ بدلنا ہے"۔

کلیم اور سلام نیچے اترے اور پنکچر ہو جانے والا پہیہ نکالنے میں مصروف ہو گئے۔ یعقوب ان کی نگرانی کرتا رہا۔ کلیم اور سلام نے دوسرا پہیہ لگایا۔ پنکچر ہو جانے والا پہیہ گاڑی میں رکھا اور آگے روانہ ہو گئے۔

لیکن چند گز جانے کے بعد ہی یعقوب کو پھر گاڑی کے دوسرے طرف جھکنے اور گڑگڑاہٹ کے ساتھ چلنے کا احساس ہوا۔ اس بار یعقوب کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے اتر کر دیکھا تو ایک اور پہیے کو پنکچر پایا۔

یعقوب نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔

اس کے پاس ایک ہی فاضل پہیہ تھا جو سلام اور کلیم لگا چکے تھے۔ دوسرے پہیے سے ہوا نکل جانے کا مطلب تھا کہ اب وہ گاڑی میں سے خراب پہیہ نکال کر اسے پنکچر لگانے والے کے پاس لے کر جائیں اور صحیح کرا کر لائیں۔

اسی وقت قریبی گلی میں سے وہی چاروں لڑکے نکلتے نظر آئے۔ یعقوب کے ذہن میں اچانک خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہی لڑکوں نے گزشتہ روز اسے قلفیاں بیچنے سے منع کیا تھا۔ پھر چند منٹ کے اندر اندر دو پہیوں کا پنکچر ہو جانا۔ یہ عجیب سی بات تھی۔ یعقوب نے غور سے سڑک پر دیکھا تو اس آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

سڑک پر چھوٹی چھوٹی کیلیں بکھری پڑی تھیں--!!

"تو یہ بات ہے۔" اس نے قریب آجانے والے ان چاروں لڑکوں کو دیکھ کر کہا: "تم لوگوں نے یہاں کیلیں بکھیری ہیں اور میری گاڑی کے دو ٹائر پنکچر کر دیے ہیں۔"

"کیلیں بکھیری ہیں۔" شہزاد نے حیرت سے کہا۔

"ٹائر پنکچر کیے ہیں۔" ضیا معصومیت سے بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو مسٹر قلفی والے؟" سرفراز کندھے اچکا کر بولا۔

"ہمیں کیا ضرورت ہے ایسا کام کرنے کی۔" شہریار نے کہا: "ہمیں تو پتا چلا تھا کہ یہاں سڑک پر کیلیں پڑی ہوئی ہیں۔ ہم تو انھیں ہٹانے آئے تھے۔"

وہ چاروں سڑک پر بکھری کیلیں چُننے میں لگ گئے۔ ذرا سی دیر میں ساری کیلیں جمع کر کے وہ ایک طرف جا کھڑے ہوئے۔

"ایک بات سُن لو۔" یعقوب نے غصّے سے کہا: "مجھے قلفیاں بیچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ آج تو خیر میرا ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔ مگر کل سے میں دیکھتا ہوں کہ مجھے یہاں آنے سے کون روکتا ہے۔"

"آؤ، آؤ۔" شہریار مسکرایا۔ "تمہیں بھلا کون روک سکتا ہے۔"

سرفراز بولا: "بس یہ دیکھ لینا کہیں تمہارا سارا منافع، نقصان میں نہ بدل جائے۔"

وہ چاروں واپس روانہ ہو گئے۔

یعقوب وہاں کھڑا دانت پیستا رہا۔

دوسرے دن یعقوب اپنی گاڑی لے کر وہاں پہنچا تو اُس کی تیز نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ غور سے دیکھتا چل رہا تھا کہ کہیں سڑک پر کیلیں نہ بکھری پڑی ہوں۔ اُسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ آج سڑک پر کیلیں نہیں ہیں۔ اس کی گاڑی وہی مخصوص میوزک بجا رہی تھی۔ اور محلّے کے بچّے قلفیاں خریدنے کے لیے جوق در جوق گاڑی کے اطراف جمع ہو رہے تھے۔ اُسے ایک لمحے کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آج جتنی بڑی تعداد میں بچّے قلفیاں خریدنے آئے ہیں۔ اس سے قبل بچوں کی اتنی بڑی تعداد اُس نے کسی ایک محلّے میں کبھی نہیں دیکھی۔ پھر یہ سوچ کر اُس کی حیرت خوشی میں بدل گئی کہ آج اُس کی قلفیاں جلدی بک جائیں گی اور وہ جلدی فارغ ہو کر گھر چلا جائے گا۔

"شاباش بیٹا، کلیم شاباش، سلام شاباش۔ جلدی جلدی دو قلفیاں جلدی کرو۔" بچّے مسلسل شور مچا رہے تھے اور ایک دوسرے سے پہلے قلفیاں خریدنے کی کوشش کر رہے تھے اور بچوں کے اس ہجوم میں شہریار چپکے سے اپنا کام دکھا چکا تھا۔ یعقوب آنے والے خطرے سے بے خبر گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھا ہوا۔۔۔ ٹھنڈی میٹھی قلفی کی آوازیں لگا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں رش چھٹ گیا اور تمام بچّے آہستہ آہستہ غائب ہو گئے۔ اور یعقوب نے مسرت و اطمینان کا سانس لیتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی مگر یہ کیا۔۔۔؟ گاڑی نے ایک دو جھٹکے لیے اور بند ہو گئی۔۔۔ یعقوب نے دو تین بار سیلف لگا کر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر گاڑی نے اسٹارٹ ہونے سے صاف انکار کر دیا۔۔۔ یعقوب ناگواری کے احساس کے ساتھ چلاّیا۔۔۔ "چلو اوئے ہڈ حراموں، او کلیم او سلام چل بے گاڑی کو دھکّا لگا" کلیم اور سلام بڑی دیر تک گاڑی کو دھکّا لگاتے رہے، کبھی آگے کبھی پیچھے وہ بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ اور اب ان ہمّت بالکل جواب دے چکی تھی مگر گاڑی تھی کہ اسٹارٹ ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

جس وقت بچّوں کا ہجوم قلفیاں خرید رہا تھا، عین اُس وقت شہریار چُھپتا ہوا آیا اور گاڑی کی ٹنکی کے قریب بچّوں کے درمیان کہیں چھُپ کر بیٹھ گیا۔۔۔ شہریار تھوڑی ہی دیر میں ٹنکی کا ڈھکنا کھولنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر جلدی سے ایک کیمیائی محلول پیٹرول کی ٹنکی میں ڈال دیا۔ محلول پیٹرول میں ملانے کے بعد شہریار بجلی کی سی تیزی سے غائب ہو گیا۔ اور کیمیائی محلول نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پیٹرول کے ساتھ گاڑی کے انجن میں پہنچ کر محلول نے پورے انجن کو ناکارہ بنا دیا۔ اور گاڑی بند ہو گئی۔

آج بچّوں کا غیر معمولی ہجوم بھی یونہی نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ حق اسکواڈ کے چاروں ننّھے ارکان نے ایک منصوبے کے تحت محلّے کے بچّوں کو قلفیاں خریدنے کے لیے جمع کیا تھا۔ تاکہ اس ہجوم میں کوئی انھیں دیکھ نہ لے۔ یہ منصوبہ پوری طرح کامیاب ہو چکا تھا۔

یعقوب کی قلفیوں والی گاڑی جب کسی بھی طرح اسٹارٹ نہیں ہوئی تو اس نے کلیم سے کہا۔۔۔ "جا اوئے کسی مکینک کو پکڑ کر لا۔۔۔" تھوڑی دیر بعد مکینک گاڑی کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد یعقوب کو بتا رہا تھا "کسی نے تمھاری گاڑی کی ٹنکی میں کیمیائی محلول ملا دیا ہے جس سے پورا انجن ناکارہ ہو گیا ہے۔ اب پورا انجن کھُلے گا جس پر کم از کم دس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔"

"دس ہزار روپے!" یعقوب کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اور وہ مکینک کا منہ تکنے لگا۔۔۔ پھر جیسے اُسے کوئی خیال آیا ہو۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ حرکت یقیناً اُنہی چار لڑکوں کی ہے۔۔۔ وہ غصّے میں پاگل ہُوا جا رہا تھا۔

"میں دیکھ لوں گا انھیں ... نمٹ لوں گا میں، نہیں چھوڑوں گا" وہ غصّے میں نہ جانے کیا کیا کچھ بک رہا تھا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان چاروں بچّوں کو کچا چبا جائے۔ مگر اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ بچّے کہاں رہتے ہیں، یا اُن کا نام کیا ہے؛ یعقوب کی بے بسی کا یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا ... ابھی اُس کی جھک جھک بند نہیں ہوئی تھی کہ ... کلیم چلّایا ...

"سیٹھ صاحب یہ کیا ہے ... دیکھیں یہ کیا ہے ... ؟؟؟" یعقوب نے پلٹ کر دیکھا ... گاڑی کی پشت پر ایک بڑا سا پوسٹر بڑی خوبصورتی سے چسپاں کیا گیا تھا جس پر بڑے خوبصورت انداز سے یہ تحریر درج تھی۔

"مسٹر قلفی والے

امید ہے تمھارے دماغ درست ہو چکے ہوں گے ... تم نے سستی اور مضرِ صحت قلفیاں سستے داموں بیچ کر بچّوں کو جو نقصان پہنچایا تھا ... یہ اُس کی سزا ہے۔ اب یقیناً تمھیں اپنی گاڑی ٹھیک کروانے کے لیے ایک بڑی رقم خرچ کرنا ہوگی تم نے ناجائز منافع سے حرام کی جو رقم جمع کی تھی وہ اب اس گاڑی کے ٹھیک کروانے پر خرچ ہوگی تو کتنا مزہ آئے گا ... یاد رکھو حرام کا پیسہ کبھی راس نہیں آتا۔ آج دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی ہو گیا ہے اور یہ دن تمھارے بُرے اعمال کی وجہ سے اللہ نے تمھیں دکھایا ہے ... اب بھی موقع ہے توبہ کر لو ... ہم چاہتے تو تمھیں بھی درست کر سکتے تھے اور تمھارے ڈوچوں کی پٹائی بھی لگا سکتے تھے۔ مگر ہم نے تمھیں موقع دینا مناسب سمجھا ... امید ہے تم آئندہ نہ صرف اس محلّے میں بلکہ شہر میں کہیں بھی خراب قلفیاں نہ بیچو گے ... ہمیں تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے ... امید ہے تم راہِ راست پر آنے کا فیصلہ کر چکے ہو گے ... تمھارے خیر خواہ۔

حق اسکواڈ"

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلۂ تحریر

اخلاق احمد کی مُہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

- بُرائیوں سے برسرِ پیکار ۴، کمسن مجاہدوں کے کارنامے
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات
- خوبصورت اسکیچز ـــ بہترین تصاویر ـــ اعلیٰ طباعت

حسین سرورق اور ۱۰۰، سے زائد صفحات

"حق اسکواڈ" حاصل کرنے کے لیے ۱۰، روپے کا منی آرڈر بھجوا دیں

پاکستان بھر میں "آنکھ مچولی" کے نیوز ایجنٹ

علم وادب کے فروغ میں جو ادارے " آنکھ مچولی " سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

محمد حسین برادرز ۔ کراچی	فون:۔ ۷۲۳۹۵۵
سلطان نیوز ایجنسی ۔ لاہور	فون:۔ ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد صاحب ۔ راولپنڈی	فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶
مہران نیوز ایجنسی ۔ حیدر آباد	فون:۔ ۲-۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی ۔ چوک یادگار ۔ پشاور	فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱
اے ایس حامد نیوز پیپر پرز ۔ ملتان	فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷
فیاض بک ڈپو ۔ فیصل آباد	فون:۔ ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز ۔ کوئٹہ	فون:۔ ۷۵۰۰۲
ملک اینڈ سنز ۔ سیالکوٹ	فون:۔ ۸۷۹۸۹

سعید بک اسٹال ۔ گجرات	فون:۔ ۰۴۳۳۱
پاکستان لسٹینڈرڈ بک اسٹال ۔ سرگودھا	فون:۔ ۶۲۹۵۱
کیپٹل نیوز ایجنسی ۔ بہاولپور	فون:۔ ۲۹۵۷
طاہر نیوز ایجنسی ۔ جہلم	فون:۔ ۰۵۹۴۱
چوہدری امانت علی اینڈ سنز ۔ رحیم یار خان	فون:۔ ۳۶۲۶
وہاڑی نیوز ایجنسی ۔ ریل بازار ۔ وہاڑی	
اسلم نیوز ایجنسی ۔ اخبار گھر ۔ گوجرانوالہ	
اشرف نیوز ایجنسی ۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ ۔ اوکاڑہ	
نیا مکتبہ اردو ۔ جی ٹی روڈ ۔ سرائے عالمگیر	

سلمان برادرز ۔ نوابشاہ فون:۔ ۲۴۱۴

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھیے!

سرکولیشن مینجر ۔ ماہنامہ "آنکھ مچولی" ڈی ۔ ۱۱۲ ۔ نورس روڈ ۔ سائٹ ۔ کراچی ۱۶

اظہر نیاز

آخری قسط

دھماکہ

وطن دوست اور ملک دشمنوں کے درمیان آخری معرکہ

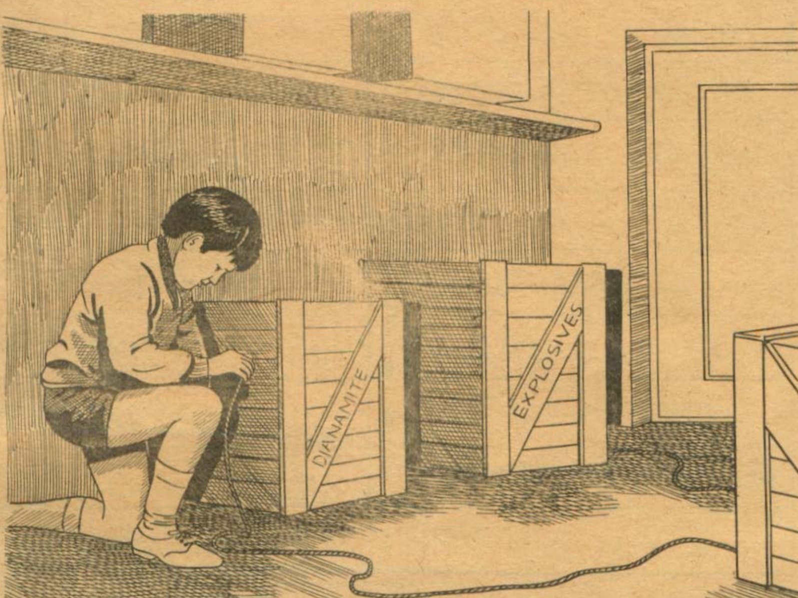

اس بار جو دھماکہ ہوا تھا، وہ اتنا شدید تھا کہ اُس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ذیشان کو ان دھماکوں نے پریشان کر رکھا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ تخریب کار پکڑے کیوں نہیں جاتے؟ اس کے ابّو آغا صاحب پولیس کے اعلیٰ افسر تھے اور پولیس اکیڈمی۔ انسٹرکٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ دھماکوں کے سلسلے میں دو تخریب کار گرفتار کیے گئے مگر ان کی رہائی کے لیے سفارشیں آنے لگیں۔ ذیشان اپنے ابّو کے ساتھ انھیں دیکھنے گیا۔ اُن میں سے ایک بلّی آنکھوں والا اور دوسرا عام سا آدمی تھا۔ اُن دونوں کو بالآخر انسپکٹر احمد نے رہا کر دیا۔ شام کو ذیشان اپنی سائیکل پر جا رہا تھا کہ اُسے بلّی آنکھوں والا کار سے اُترکر جاتا نظر آیا۔ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور اُس کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ شخص ایک اسٹور سے "بلیک مین" پرفیوم خرید کر گاڑی میں چلا گیا۔ ذیشان واپس گھر چلا۔ راستے میں اُس کی سائیکل ایک

موٹر سائیکل سے ٹکرا گئی۔ جس سے وہ دونوں گر گئے۔ گھر پہنچ کر ذیشان کو پتہ چلا کہ اس کی جیب میں ڈائری نہیں ہے۔ یکایک اسے خیال آیا کہ اس کی تلاش کے ٹکرانے والا آدمی وہی تھا' جسے اُس نے بلی آنکھوں والے کے ساتھ دیکھا تھا۔ اگلے دن کوئی آدمی ڈائری واپس کر گیا۔ ذیشان فوراً سائیکل لے کر اُس کی تلاش میں نکلا اور بالآخر اُس تک جا پہنچا۔ وہ شخص اُس سے بڑی اپنائیت سے باتیں کرنے لگا۔ مگر ذیشان مسلسل خطرے کی بُو محسوس کر رہا تھا۔ اور اُس کا اندازہ درست ثابت ہُوا۔ کیوں کہ اُن کی باتوں کے دوران ایک جیپ اُن کے پاس آ کر رُکی اور دو آدمیوں نے ذیشان کو قابو کر کے اُسے گاڑی میں ڈال دیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اُسے "بلیک مین" خوشبو کا جھونکا محسوس ہُوا۔ آغا صاحب کو ذیشان کی گمشدگی کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوری طور پر اُس کی تلاش شروع کروا دی۔ لیکن اُس کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ پھر ایک دن وہ بڑی خاموشی سے واپس آ گیا۔ آغا صاحب اور پولیس کے افسران' اُس سے معلومات کرنے لگے۔ مگر ذیشان کوئی خاص بات نہ بتا سکا۔ وہ اپنے طور پر بھی اُس جگہ کا سُراغ لگانے کا ارادہ رکھتا تھا' جہاں اُسے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ یکایک فون کی گھنٹی بجی اور نامعلوم شخص نے

آغا صاحب کو دھمکی دی کہ وہ ان کے راستے سے ہٹ جائیں' ورنہ خطرناک نتائج کے لیے تیار رہیں۔ اس کال کے بعد ایسی تمام جگہوں کی نگرانی کا فیصلہ کیا گیا' جہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ اس کے اگلے دن لاہور کے ایک دینی جلسۂ عام میں بموں کے دھماکے ہوئے اور بہت سے لوگ اور عالمِ دین شہید ہو گئے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد کراچی کے بازار میں دھماکہ ہو گیا۔ ایک افسر نے شک ظاہر کیا کہ جو بھی فیصلے کیے جاتے ہیں' تخریب کار اُن سے کسی طرح آگاہ ہو جاتے ہیں' لہٰذا اس بات کا پتا لگانا چاہیے کہ وہ کس طرح میٹنگ کی گفتگو سُنتے ہیں۔ ذیشان چھپ کر یہ ساری باتیں سُن رہا تھا اور دل میں فیصلہ کیا کہ وہ خود تخریب کاروں کا کھوج لگائے گا۔ اس شک کے بعد کہ مجرم میٹنگ کی کارروائی سُن لیتے ہیں' آغا صاحب کے گھر اور ملازمین کی تلاشی لی گئی' مگر کچھ نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔ جدید ترین آلات سے لیس تلاشی پر مامور انسپکٹر شعیب نے شک ظاہر کیا کہ ٹرانسمیٹر ذیشان کے پاس ہے۔ آغا صاحب نے بڑی چالاکی سے ذیشان کی تلاشی لی' مگر اُس کے پاس سے کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی۔ آغا صاحب نے یہ بات انسپکٹر شعیب کو بتائی تو اُسے شک ہُوا کہ آغا صاحب اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں' تلاشی اُسے خود لینی چاہیے تھی۔

تلاشی لی' مگر اُس کے پاس سے کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی۔ آغا صاحب کو شک ہُوا کہ ذیشان کہیں تخریب کاروں سے نہ مل گیا ہو۔ ایک دن جب بیماری میں انہوں نے کیپسول کھایا تو یہ مسئلہ فوری طور پر حل ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں خیال آیا کہ ذیشان کے جسم میں بھی اسی طرح کا کوئی مائیکرو ٹرانسمیٹر کیپسول چھپایا گیا ہے' جس سے وہ لاعلم ہے۔ خصوصی آلے کی مدد سے چیک کرنے پر یہ شک درست ثابت ہُوا۔ اُس کے بعد آغا صاحب نے میٹنگ کی جگہ بدل دی اور خصوصی کمیٹی کو ایک گرینڈ پلان تیار کرنے کی ہدایت کی۔ ذیشان اپنے دوست طارق کے گھر میں کھیل رہا تھا کہ اُس کے نام کال آئی اور نامعلوم شخص نے اُسے دھمکی دی کہ اگر اپنے باپ کی زندگی چاہتے ہو تو گرینڈ پلان والی فائل کی فوٹو کاپی بنوا کر ہمارے حوالے کر دو' ورنہ تمہارے باپ کو بم سے اُڑا دیا جائے گا۔ ذیشان اپنے ابو کی جان کے بدلے اس کام پر رضامند ہو گیا اور فائل چُرا کر گھر سے قریب ترین فوٹو اسٹیٹ کی دُکان پر پہنچا۔ ابھی فائل کی فوٹو کاپی بن رہی تھی کہ دُکان میں بلیک مین خوشبو کا جھونکا آیا اور بلی آنکھوں والا بھیڑ نما آدمی اندر داخل ہُوا۔ فائل کی ساری نقول اُس نے خود لے لیں اور بل ادا کر کے سُرخ ہیجیرو میں بیٹھ کر چلا گیا۔ ذیشان گھر واپس آیا اور فائل دوبارہ اپنی جگہ رکھ دی۔ اگلے دن وہ طارق کو لے کر اُس علاقے کی تلاش میں نکلا' جہاں اُسے اغوا کر کے رکھا گیا تھا۔ کافی تلاش کے بعد اُسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو ہی گئی۔ اُسے ایک بنگلے میں وہی سُرخ ہیجیرو کھڑی نظر آئی۔ اُس نے تخریب کاروں کے اڈے کا پتہ چلا لیا تھا!

ایک دن صبح سویرے ذیشان کے گھر میں فون کے ذریعے اطلاع ملی کہ آغا صاحب کو ایک اہم فائل کی فوٹو اسٹیٹ تخریب کاروں کے حوالے کرنے پر گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ذیشان اپنے ابو سے ملا تو انہوں نے اسے تسلی دی۔ اپنے وکیل کو انہوں نے بتایا کہ انسپکٹر احمد نے انہیں پھنسانے کی کوشش کی ہے کیونکہ وہ تخریب کاروں سے ملا ہُوا ہے۔ مگر جس فائل کی فوٹو اسٹیٹ ذیشان نے کروائی وہ بھی نامعلوم افراد ان کے ہاں سے لے اُڑے۔ آغا صاحب کی ضمانت بھی نہیں ہو سکی تھی۔ اسی دوران انسپکٹر احمد کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اس طرح کیس آغا صاحب کے خلاف مزید اُلجھ گیا۔ ایک دن ذیشان نے انہیں بتایا کہ وہ تخریب کاروں کے ملنے کی جگہ جانتا ہے جو سیکٹر زیڈ میں واقع ہے۔ انہوں نے اُسے سختی سے تاکید کی کہ وہ ان کے باہر آنے تک اس واقع کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اسی دوران ان کے وکیل نے انہیں خوشخبری سُنائی کہ اگلی صبح ان کی ضمانت ہو جائے گی۔

ذیشان اور طارق سیکٹر زیڈ میں واقع تخریب کاروں کے ہیڈ کوارٹر کے گرد گھوم رہے تھے۔ انہوں نے وہاں غیر معمولی طور پر زیادہ رونق دیکھی۔ اِدھر آغا صاحب جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ذیشان اُس بنگلے میں داخل ہو گیا جو تخریب کاروں کا مرکز تھا۔ جب کہ اُس نے طارق کو انسپکٹر شعیب کا فون نمبر دے کر روانہ کر دیا تھا۔ اچانک اُسے بلیک مین کی خوشبو محسوس ہوئی۔ انسپکٹر شعیب ذیشان کے لاکٹ سے نشر ہونے والے سگنل کی مدد سے جب اس مقام پر پہنچا تو اُس نے طارق کو وہاں دیکھا۔ اس نے انسپکٹر کو بتایا کہ ذیشان بنگلے میں داخل ہو گیا ہے اور کافی دیر سے واپس نہیں آیا۔ انسپکٹر نے پولیس کو اس بنگلے کے اطراف میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ اتنے میں وہاں آغا صاحب بھی پہنچ گئے۔ انسپکٹر شعیب ان کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

اب آپ آگے ملاحظہ فرمائیں

آغا صاحب بضد تھے کہ وہ بنگلے کے اندر جا کر پہلے حالات کا جائزہ لیں گے اور بعد میں کسی ایکشن کی طرف قدم اُٹھائیں گے۔ انسپکٹر شعیب نے تھوڑی سی بحث کے بعد آغا صاحب کی بات مان لی اور اس طرح پورے کا پورا آپریشن آغا صاحب نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

آغا صاحب نے انسپکٹر شعیب سے کہا وہ باہر ٹھہرے اور مزید آنے والی پولیس فورس کو چاروں طرف چھپا دے اور کسی بھی آخری ایکشن سے پہلے اردگرد کے تمام گھروں کے مکینوں کو کسی بھی ہنگامی صورتِ حال کے بغیر کسی دوسری جگہ منتقل کر دے تاکہ بھگدڑ میں مجرموں کو بھاگنے کا موقع نہ ملے۔ آغا صاحب نے چند تربیت یافتہ پولیس کے آدمیوں کا انتخاب کیا اور بنگلے کے اندر کُود گئے۔ کتّوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ بنگلے کے اندر مسلّح افراد کے بُوٹوں کی آواز کتّوں کے بھونکنے کے ساتھ شامل ہونے لگی لیکن جلد ہی خاموشی چھا گئی کیونکہ آغا صاحب کے آدمیوں نے سیکورٹی گارڈز پر قابو پا لیا تھا اور ان کو بے بس کرنے کے بعد گھسیٹ کر ایک طرف چھپا دیا تھا۔ کتّوں کو بے آواز گولیاں پہلے ہی موت کی نیند سُلا چکی تھیں۔

آغا صاحب نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ بڑے ہال۔۔۔ میں میٹنگ جاری تھی۔ ملک کی تباہی کے منصوبے پر اس وقت سب دستخط کر رہے تھے۔ آغا صاحب نے انسپکٹر شعیب سے وائرلیس پر بات کی اور کہا۔ "میرا تو خیال تھا کہ یہ معمولی پھوڑا ہے لیکن یہ تو کینسر ہے۔ فوری ایکشن پر عمل درآمد کرو اور اپنی تمام فورس سے کہو کہ وہ اس بنگلے کو اپنے گھیرے میں لے لے اور ایک ایک کر کے اندر داخل ہو جائے کوئی بھی آدمی اس بنگلے سے بھاگنے نہ پائے۔ خاص طور پر مین گیٹ کے سامنے اپنے اہم آدمیوں کو لگا دو"!

اس کے بعد آغا صاحب نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ اس محل نما بنگلے کے تمام کمروں کا جائزہ لیں اور ذیشان کو تلاش کریں۔ تمام پولیس والے چاروں طرف پھیل گئے اور آغا صاحب باہر سے اندر آنے والے پولیس کے مزید آدمیوں کی ذمّہ داریاں لگانے لگے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ بنگلے کی نگرانی کرنے والے تمام سیکورٹی گارڈز کو قابو کر لیا اور ہال کے گرد اپنے آدمی کھڑے کر دیے۔

اس وقت تک بنگلے میں بالکل خاموشی تھی اور ایک گولی چلنے کی آواز بھی نہیں آئی تھی، لیکن معلوم نہیں کس نے بیوقوفی کی اور ایک طرف سے کلاشنکوف کے پے در پے فائر کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ ایک پولیس مین نے آکر بتایا۔ "ایک پولیس آفیسر مارا گیا ہے اور ان لوگوں کو بھی ہمارے اندر آنے کا پتہ چل چکا ہے"۔ یہ سُنتے ہی آغا صاحب نے سوچا کہ اب مزید دیر کرنے کی ضرورت نہیں انھوں نے پولیس فورس کو اشارہ کیا کہ وہ ہال کے اندر داخل ہو جائے۔

تمام دروازوں سے پولیس داخل ہو گئی اور اندر کے قہقہے یکدم خاموشی میں بدل گئے۔ آغا صاحب نے اپنی گرجدار آواز میں تمام لوگوں کو حکم دیا کہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیں۔ ان میں سے ایک شخص نے ہاتھ اُٹھانے کے ساتھ ہی آغا صاحب پر گولی چلا دی۔ آغا صاحب نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ دونوں طرف سے بیک وقت فائر ہوئے وہ شخص تو میز کے اوپر ہی گر پڑا۔ لیکن اس کی گولی سے آغا صاحب بھی زخمی ہو گئے تھے۔

آغا صاحب پھر دہاڑے "اگر کسی نے حرکت کی تو تمام لوگوں کو بھون کر رکھ دوں گا"۔ اتنے میں ایک شخص نے جس کی بلّی آنکھیں اور سنہرے بال تھے اور سفید ریچھ جیسے نوکیلے دانت تھے ---۔ آغا صاحب کو مخاطب کیا۔

"آغا عمران۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ ہماری راہ میں نہ آؤ لیکن تمھیں نہ تو اپنی جان عزیز ہے اور نہ اپنے بیٹے کی ----۔ شاید اپنے بیٹے کی محبت ہی اب تمھیں ہمارے پاس کھینچ لائی ہے۔ جو اس وقت میرے قبضے میں ہے اور میرا ایک اشارہ اُسے موت کی نیند سُلا سکتا ہے۔ اب تمھاری خیریت اسی میں ہے کہ تم چپکے سے نکل جاؤ"۔

"بکواس بند کرو کتّے مجھے اپنے بیٹے کی نہیں، وطن کی محبت یہاں کھینچ لائی ہے اور میں کسی قیمت پر تمھیں نہیں چھوڑوں گا"۔

آغا صاحب زخمی تھے لیکن وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کھڑے تھے اور ان کی آواز میں ایک رُعب اور دبدبہ نمایاں تھا۔

"آغا!" وہی سفید ریچھ پھر آغا صاحب سے مخاطب ہوا "تمھیں تو معلوم ہے کہ تمھارے بیٹے کے جسم کے اندر ٹرانسمیٹر چپکا دیا گیا ہے"۔

"ہاں مجھے معلوم ہے"۔ آغا صاحب نے جواب دیا۔

"اور اسی لیے تم اپنے بیٹے سے کاغذ پر لکھ کر باتیں کرتے تھے لیکن تمھیں شاید معلوم نہیں کہ اس ٹرانسمیٹر کا ایک حصّہ طاقتور ٹائم بم بھی ہے اور میں صرف ایک بٹن دبا دوں تو ٹھیک پانچ منٹ کے بعد تمھارا بیٹا دھماکے سے اُڑ جائے گا"۔

آغا صاحب کو لگا جیسے گولی ان کے بازو میں نہیں بلکہ دل میں لگی ہو۔

بلّی آنکھوں والے نے اپنے سیکورٹی گارڈ کو اشارہ کیا۔

"جاؤ ذیشان کو لے آؤ"۔ لیکن تھوڑی دیر بعد واکی ٹاکی پر سیکورٹی گارڈ کی آواز سُنائی دی۔

"باس! ذیشان تو وہاں نہیں ہے اور مجھے مسٹر آغا کے آدمیوں نے پکڑ لیا ہے"۔

" تو اس کا مطلب یہ ہے مسٹر آغا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان گفتگو کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان گفتگو ختم ہونے کا مطلب ایک بڑی طاقت اور ایک چھوٹی طاقت کے درمیان گفتگو ختم ہوتا ہے اب بھی وقت ہے اپنے سپاہیوں کو میرے بنگلے سے باہر لے جاؤ ورنہ میں بٹن دبانے لگا ہوں اور پھر تمہارے پاس صرف پانچ منٹ رہ جائیں گے اور ان پانچ منٹوں میں تم شاید اپنے بیٹے کو اسپتال بھی نہ پہنچا سکو!" بلی آنکھوں والے آدمی نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ آغا صاحب کوئی فیصلہ کرتے وائرلیس پر انھیں انسپکٹر شعیب کا سگنل موصول ہوا۔

" آغا صاحب اپنے سپاہیوں کے ساتھ بنگلے سے باہر نکل آئیں "۔

" یہ نہیں ہو سکتا" آغا صاحب دہاڑے۔

" آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ آپ بنگلے سے باہر نکل آئیں اور مین گیٹ کے پاس آکر میری بات سنیں"۔

" رائٹ!" آغا صاحب نے کہا اور اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ باہر نکل چلیں بلی آنکھوں والا بہت زور سے قہقہے لگا رہا تھا اور سپاہی بڑی خاموشی سے باہر نکل رہے تھے۔ آغا صاحب جوں ہی دروازے سے باہر نکلے تخریب کاروں کے ساتھیوں نے دوبارہ اپنی کلاشنکوف سنبھال لیں اور بلی آنکھوں والے سفید ریچھ نے زور سے آواز دیتے ہوئے آغا صاحب سے کہا۔

" آغا۔۔۔! اپنے بیٹے کو اسپتال لے جاؤ میں نے بٹن دبا دیا ہے" اور اس کے ساتھ ہی تخریب کاروں نے اپنے بنگلے سے سپاہیوں پر فائرنگ کھول دی۔

آغا صاحب نے اوٹ میں آتے ہوئے انسپکٹر شعیب کی طرف دیکھا۔

" آپ تسلی رکھیں" انسپکٹر شعیب نے آغا صاحب کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

" اندر جو کچھ ہو رہا تھا مجھے ایک ایک بات کا پتہ لگ رہا تھا میں نے ذیشان کو پہلے ہی اسپتال پہنچا دیا ہے۔ آپ فوراً وہاں پہنچیں"۔

" ٹھیک ہے میں جاتا ہوں لیکن اس بنگلے کے اندر سے کوئی بھاگنے نہ پائے"۔ آغا صاحب نے جلدی سے کہا اور اسپتال روانہ ہو گئے۔

انسپکٹر شعیب سوچنے لگا کہ جو کچھ ذیشان نے بنگلے کے اندر کیا ہے۔ اس کے بعد کوئی بھی اس بنگلے سے باہر نہ جا سکے گا۔ آغا صاحب کے جاتے ہی انسپکٹر شعیب نے اسپتال وائرلیس پر بات کی تو پتہ چلا کہ ابھی تک

ذیشان کے جسم سے ٹائم بم باہر نہیں نکل سکا۔

"کیا آپریشن کیا جارہا ہے؟" انسپکٹر شعیب نے پوچھا۔

"نہیں" دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔

"ڈاکٹر قدیر کی نئی دریافت ایک انجکشن ہے جسے لگانے سے جسم کے اندر جو بھی خلافِ جسم کوئی چیز ہو وہ باہر نکل جاتی ہے۔ وہ انجکشن لگا دیا گیا ہے۔ لیکن ابھی تک وہ کیپسول باہر نہیں نکلا۔"

"دیکھو اب صرف چار منٹ باقی ہیں" انسپکٹر شعیب نے جلدی سے کہا۔ "خُدا نہ کرے وہ ٹائم بم پھٹ جائے۔ ڈاکٹروں سے کہو وہ جلدی کریں۔"

آغا صاحب ٹھیک پانچ منٹ بعد اسپتال کے دروازے پر تھے۔ زخمی ہونے کی وجہ سے ان کا اپنا خون کافی نکل چکا تھا لیکن ذیشان کی وجہ سے وہ کانپ رہے تھے۔ وہ دروازے پر ہی کھڑے ہو گئے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ آپریشن تھیٹر کے باہر تھے۔ وہاں سے پتہ چلا کہ ذیشان ڈاکٹر صدیقی کے کمرے میں ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ٹھیک ہے"۔ آغا صاحب نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ڈاکٹر صدّیقی کے کمرے میں پہنچے تو ذیشان اور ڈاکٹر صدّیقی کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی آغا صاحب کی جان میں جان آئی۔ انھوں نے جاتے ہی ذیشان کو اپنے آپ سے لپٹا لیا۔ اور بچّوں کی طرح رونے لگے۔ ڈاکٹر صدّیقی نے فون کر کے ایمرجنسی سے ڈاکٹر کو بُلایا اور آغا صاحب کے بازو سے گولی نکال کر مرہم پٹّی کرنے کے لیے کہا۔

مرہم پٹّی کے بعد ڈاکٹر صدّیقی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"ذیشان کے جسم میں موجود کیپسول کے دو حصّے تھے ایک ٹرانسمیٹر تھا اور دوسرا ٹائم بم تھا۔ ہم وقت سے تقریباً ایک منٹ پہلے کیپسول باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور کیپسول کو بم ضائع کرنے والے اسکواڈ کے حوالے کر دیا گیا۔ جنہوں نے فوری طور پر اُسے ناکارہ بنا دیا۔"

آغا صاحب نے اطمینان کا سانس لیا تو ذیشان نے پوچھا۔

"ابُّو! آپ کے ہوتے ہوئے تخریب کاروں کے بنگلے میں کوئی دھماکہ تو نہیں ہوا؟"

"نہیں، لیکن کیا وہاں کوئی دھماکہ ہونے والا تھا؟" آغا صاحب نے ذیشان سے پوچھا۔

"ہاں" ذیشان نے کہا۔ "میرے خیال میں اب تک تو وہاں دھماکہ ہو چکا ہو گا۔ کیونکہ تخریب کاروں نے مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ لیکن میں کھڑکی کا شیشہ توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر بنگلے کے اندر گھومنے لگا۔ بنگلے کے اندر گھومتے گھومتے ان کے تہہ خانے میں چلا گیا۔ تہہ خانے کے دروازے پر بہت بڑا

تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے ایک سلاخ کا لیور بنا کر وہ تالا توڑ ڈالا۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ اس تہہ خانے میں گولہ بارود، اسلحہ، کلاشنکوف اور کروڑوں روپے موجود تھے۔ میں نے ایک رسّی کو آگ لگا کر بارود کے ڈھیر میں دبا دیا اور پھر باہر نکل کر دروازے کو بند کر دیا۔ باہر نکلتے ہی مجھ کو سپاہیوں نے دیکھ لیا اور مجھے انسپکٹر شعیب کے پاس لے گئے اور انھوں نے فوری طور پر مجھے اسپتال پہنچا دیا۔ اور غالباً آپ نے انھیں اتنا مصروف رکھا کہ انھیں پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کب اور کہاں پہنچ گیا۔"

● انسپکٹر شعیب نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح وہ تخریب کاروں کو پکڑ سکے تاکہ اس بین الاقوامی سازش کا پتہ لگ سکے بار بار میگا فون پر اعلان کیا "آپ سب لوگ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں اور باہر نکل آئیں کیونکہ یہ بنگلہ دھماکے سے اُڑنے والا ہے۔" لیکن جواباً تخریب کاروں نے گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ آخر آگ گولہ بارود تک پہنچ گئی۔ پہلے ایک آدھ ہلکے پھلکے دھماکے ہوئے اور پھر ایک زور دار دھماکے کے ساتھ تمام بنگلہ روشن ہو گیا۔ اور وہ شاندار محل پلک جھپکنے میں ملبے کا ڈھیر بن گیا۔

ملبے کے ڈھیر میں کوئی بھی زندہ نہ بچا کہ وہ بتا سکے کہ وہ کون ہے اور کس کے اشارے پر اس ملک میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔

● آغا صاحب پولیس اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے اور ذیشان کو چھٹیوں کے بعد آج پہلے دن اسکول جانا تھا۔ آغا صاحب اکیڈمی جاتے ہوئے ذیشان کو اسکول چھوڑتے ہوئے جاتے تھے۔ جُوں ہی وہ دونوں پولیس کار میں بیٹھے اور ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی، مالی بابا نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر قریب آکر ایک تحفہ آغا صاحب کے حوالے کیا۔

"ایک آدمی آپ کے لیے دے گیا ہے۔" بابا نے بتایا۔

آغا صاحب نے تحفہ کھولا اندر بلیک مین پرفیوم تھا۔ ذیشان نے فوراً پوچھا،

"بابا وہ آدمی کیسا تھا؟"

"سُرخ رنگ کی جیپ میں آیا تھا۔ بلّی آنکھیں جو اپنے چہرے کے لحاظ سے چھوٹی تھیں۔ میں نے اس سے نام بھی پوچھا تھا لیکن اُس نے کہا کہ آغا صاحب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم بس یہ تحفہ ان تک پہنچا دینا۔ اور ہاں سر! ایک بات اور، وہ آدمی ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتا تھا، جیسے کوئی ریچھ غُرّا رہا ہو۔"

"اُوہ، اُوہ" ذیشان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"کیا اُس بنگلے کے سب تخریب کار بچ گئے ہوں گے؟"

"نہیں بیٹے": آغا صاحب نے جواب دیا۔

"صرف ان کا سردار بچا ہے اور یہ اتنا سنگدل شخص ہے کہ خطرناک موقعوں پر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو بھی نہیں بخشتا۔ اس بنگلے میں ضرور کوئی خفیہ راستہ ہوگا جس کا علم کسی اور کو نہیں ہوگا۔ اُس نے اپنی جان تو بچالی لیکن اپنے تمام ساتھیوں کو اپنے ہاتھوں سے موت کے حوالے کر دیا۔ اس کی دوستی اور دشمنی دونوں خطرناک ہے۔ خیر اللہ کی مدد ہمارے ساتھ رہی تو وہ دن ضرور آئے گا جب ہم اپنے چھپے ہوئے دشمن کو اپنے گھر سے نکال باہر کریں گے۔"

"انشاء اللہ!" ذیشان نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

ختم شد

تحریری مباحثہ ——— اس ایوان کی رائے میں

"طالبات طلبہ سے زیادہ ذہین ہیں۔"

موافقت کی ایک آواز ——— تعلیمی نتائج طالبات کی ذہانت کی اعلیٰ مثال اور طلبہ کی کند ذہنی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

مخالفت کا ایک لہجہ ——— طالبات ذہین نہیں، طوطے کی طرح رٹّو ہیں۔ طالبات ذہین ہوتیں تو دنیا کو مرد تسخیر نہ کرتے۔

آپ کا کیا موقف ہے! آپ کے خیال میں طالبات زیادہ ذہین ہیں یا طلبہ؟ آپ کی جو رائے بھی ہو اُسے (زیادہ سے زیادہ) دو فُل اسکیپ صفحات پر صاف اور خوش خط تحریر کر کے ہمیں بھجوا دیں۔ دو بہترین تحریروں کو شائع بھی کیا جائے گا اور خوبصورت انعام بھی دیا جائے گا۔ مقابلے میں حصّہ لینے کی آخری تاریخ **۲۵** ستمبر ۸۸ء ہے۔

تحریری مباحثہ ۔ ماہنامہ آنکھ مچولی ۔ ۱۱۲ ۔ ڈی ۔ گرین گائیڈ اکیڈمی ۔ سائٹ ۔ کراچی ۱۶

سائنس انکوائری

نیّر ابدالی

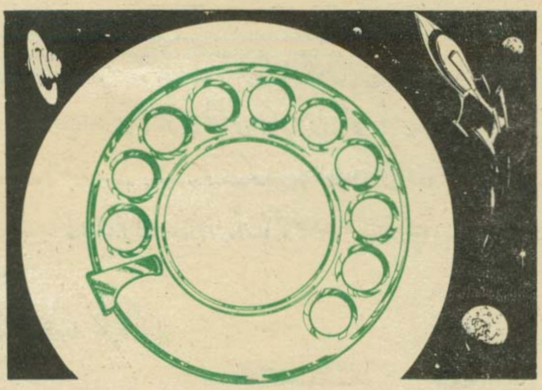

○ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ انسان کے جسم میں وہ کون سا عضو ہے جو بھوک کے باعث کام کرنا چھوڑ دیتا ہے؟

(عظمت اللہ ۔ اورنگی ٹاؤن ۔ کراچی)

انسانی جسم میں معدہ ہی وہ عضو ہے جو خوراک کو ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہی عضو ہمیں بھوک کا احساس دلاتا ہے۔ جس طرح کسی کار میں جب پٹرول ختم ہونے لگتا ہے تو اس کا فیول میٹر اس کی نشاندہی کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جسم کی مشین کا فیول یعنی کیلوری ختم ہونے لگتی ہے۔ تو معدے میں بہت ہلکا میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے۔ اسی درد کو بھوک کہا جاتا ہے۔ یہ درد عموماً چھ گھنٹے کے بعد ہوتا ہے۔ تندرست رہنے کے لیے ضروری ہے کہ بھوک لگتے ہی کھانا کھا لیا جائے اور بالکل سیر ہو کر نہ کھایا جائے۔

○ مجھے آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ چائے پینے سے پہلے یا بعد میں پانی پینا نقصان دہ ہے یا مفید؟

(کامران سلیم ۔ سندھی ہوٹل، نیو کراچی ۔ کراچی)

بات یہ ہے کہ چائے پینے کے فوراً بعد پانی یا پانی پینے کے فوراً بعد چائے پینا دانتوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس سے دانتوں کی فرسودگی اور مختلف بیماریوں کے پیدا ہونے کا خطرہ موجود ہوتا ہے۔ طبّی نقطۂ نظر سے چائے پینے کے کم از کم بیس منٹ بعد پانی پینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح پانی پینے کے بیس منٹ بعد آپ مزے سے چائے کی چسکیاں لے سکتے ہیں۔

○ زمین سے سب سے زیادہ دور سیارے کا نام اور فاصلہ بتائیے؟ (سحر ناز ۔ چوہنگ ۔ لاہور۔)

زمین سے سب سے زیادہ دور سیارہ پلوٹو ہے۔ اس کا زمین سے فاصلہ ۳۶۸۰ ملین میل ہے اس سیارے کا قطر ۳،۷۰۰ میل ہے۔ آپ صرف سیارے کو انتہائی طاقت ور دوربین سے ہی دیکھ سکتی ہیں۔ پلوٹو ۲۴۸ برسوں میں

سورج کے گرد اپنا چکر مکمل کرتا ہے۔

○ ہمارے نظامِ شمسی کا سیارہ زحل سورج سے کتنا دُور واقع ہے؟ اور اس کے گرد حلقہ کس چیز کا ہے؟

(ذیشان احمد ڈکریا۔ سرگودھا)

زحل یا SATURN سورج سے ۸۸۶.۱۲ ملین میل دُور ہے۔ اس کے چاروں طرف مختلف دھاتی اجسام گردش کرتے رہتے ہیں۔ اس سیارے کے دو چاند ہیں اور اس کا قطر ۱۵۰۰۰ میل ہے۔ یہ زمین سے ۹½ گنا بڑا ہے۔ زحل سورج کے گرد اپنا چکر ۲۹½ سال میں مکمل کرتا ہے۔ تازہ ترین تحقیقات کے مطابق زحل پر زندگی کے آثار نہیں پائے

○ میں نویں جماعت کا طالب علم ہوں اور مجھے سیکرٹ ایجنٹ بننے کا شوق ہے۔ مہربانی فرما کر یہ بتائیے کہ سیکرٹ ایجنٹ کیسے بنا جاتا ہے؟ (نصیر الدین زاہد۔ ڈیرہ اسماعیل خان)

بھائی صاحب! پہلے تو ہم آپ کو اس لفظ سیکرٹ ایجنٹ کی وضاحت کر دیں۔ یہ دو الفاظ یعنی سیکرٹ (خفیہ) اور ایجنٹ (نمائندہ) سے مل کر بنا ہے۔ ایک سیکرٹ ایجنٹ عموماً اپنے ملک کو دوسرے ملکوں کے قیمتی راز اور دیگر معلومات فراہم کرتا ہے۔ دراصل سیکرٹ ایجنٹ کا تصوّر جیمز بانڈ اور دی سینٹ جیسے کرداروں پر بنی ہوئی فلموں کی وجہ سے پیدا ہُوا ہے۔ ورنہ ان کرداروں کی تخلیق سے قبل اور آج بھی ہر حکومت ملک کی حفاظت کے لیے مختلف سراغرسانی کے ادارے قائم کرتی ہے۔ جن میں شامل افراد کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ملک دشمن عناصر پر کڑی نظر رکھیں اور ضرورت پڑے تو ان کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دی جائے۔ ہمارے ہاں فلموں کے روایتی سیکرٹ ایجنٹ تو نہیں البتہ آپ اگر ملک کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں تو سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے پولیس کی اعلیٰ ملازمت میں جا سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پولیس کے محکمے میں بھی سادہ لباس والے سراغرساں ہوتے ہیں۔ انھیں بھی آپ "سیکرٹ ایجنٹ" کہہ سکتے ہیں۔

○ سعودی عرب، بھارت اور بنگلہ دیش وقت کے حساب سے ہم سے کتنا آگے اور پیچھے ہیں؟

(افشین فاطمہ۔ ناظم آباد، کراچی - سید فرید عالم، اورنگی ٹاؤن، کراچی)

اگر پاکستان میں دن کے بارہ بجے ہوں تو سعودی عرب میں دن کے دس بجے ہوں گے۔ بھارت میں دن کے ساڑھے بارہ اور بنگلہ دیش میں دن کا ایک بجا ہوگا۔ یعنی سعودی عرب ہم سے دو گھنٹے پیچھے ہے۔ جبکہ بھارت نصف گھنٹہ اور بنگلہ دیش ایک گھنٹہ آگے ہے۔

پانی میں شیشہ کاٹیے

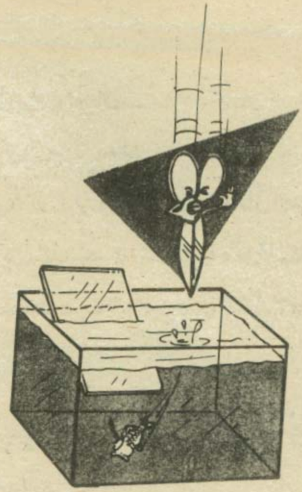

آپ نے اکثر گتہ، کاغذ یا کپڑے کے ٹکڑے کو قینچی کی مدد سے بڑی آسانی کے ساتھ کاٹا ہوگا۔ آج ہم آپ کو بتائیں گے کہ قینچی کی مدد سے شیشہ کس طرح کاٹا جا سکتا ہے۔

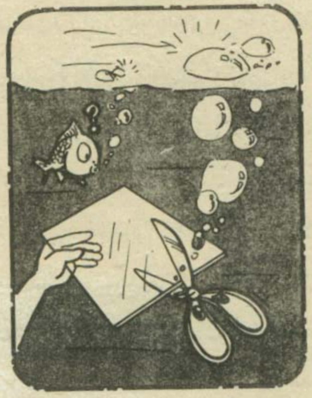

ارے آپ تو حیران ہو گئے! ویسے بات تو حیرانی کی ہے، لیکن ہر کام کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور ہوتا ہے۔ شیشہ کاٹنے کے لیے آپ پہلے ایک بڑے ٹب میں پانی بھر لیں۔ اب ایک ہاتھ میں شیشہ پکڑیے اور دوسرے میں قینچی۔ اب دونوں ہاتھ پانی میں ڈال دیں اور ہاں آستین اونچی کرنا ہرگز نہ بھولیے گا، ورنہ قمیض گیلی ہو جائے گی اور امّی جان سے ڈانٹ سُننا پڑے گی۔

اب اپنے دونوں ہاتھ پانی میں رکھتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق آپ شیشے کو کاٹنا شروع کر دیں۔ جی ہاں! شیشہ اس طرح کٹنے لگے گا جیسے وہ کاغذ یا گتے کا ٹکڑا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیشے پر پڑنے والے دباؤ کو پانی نے جذب کر لیا اور شیشہ ترخنے سے بچ گیا۔

احمد حاطِب صدّیقی

یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

احمد حاطب صدیقی کی نظم "یہ بات سمجھ میں آئی نہیں" جنوری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی جسے ہمارے ساتھیوں نے بے حد پسند کیا۔ قارئین کی بے حد فرمائش پر حاطب صدیقی صاحب نے اس نظم میں تین خوبصورت بند کا اضافہ کیا ہے۔ جو آپ کے مطالعے کے لیے شائع کیے جا رہے ہیں۔

"نانی" کے میاں تو "نانا" ہیں   "دادی" کے میاں بھی "دادا" ہیں
تو "آپی" سے میں نے پوچھا   "باجی" کے میاں، کیا "باجا" ہیں
وہ ہنس ہنس کر بس کہنے لگیں   "اے بھائی نہیں! اے بھائی نہیں"
یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

جب نیا مہینہ آتا ہے   بجلی کا بِل آجاتا ہے
حالانکہ بادل بے چارا   یہ بجلی مفت بناتا ہے
پھر اپنے گھر میں بھی بجلی   کیوں بادل سے لگوائی نہیں
یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

گر بلّی شیر کی خالہ ہے   پھر ہم نے اُسے کیوں پالا ہے
کیا شیر بہت نالائق ہے   خالہ کو مار نِکالا ہے
یا جنگل کے راجا کے ہاں !   کیا ملتی دُودھ ملائی نہیں
یہ بات سمجھ میں آئی نہیں

کیا آپ پینسل اس پر اس طرح پھیر سکتے ہیں کہ پینسل اپنی جگہ سے نہ اُٹھے اور کسی مقام پر دوہرا کر نہ چلے ۔

منتخب لطائف اور مزے دار کارٹونز کے

کھٹے میٹھے

سائنس کے اُستاد نے طلبہ کو دُودھ کے عنوان پر مضمون لکھنے کو کہا۔ مضمون کے بارے میں اُستاد نے ہدایت دی کہ اُسے کم از کم چار صفحات پر مشتمل ہونا چاہیے۔ ایک شاگرد نے تھوڑی دیر بعد ہی ایک صفحہ لکھ کر اُستاد کو دکھایا تو اُستاد نے ناراضگی سے کہا۔

"نالائق میں نے چار صفحے لکھنے کو کہا تھا۔"

"سر میرا مضمون خشک دودھ پر ہے۔" بچّے نے معصومیت سے جواب دیا۔

عظمیٰ تبسّم ۔ نارتھ ناظم آباد

ایک صاحب نے تھانے میں رپورٹ درج کراتے ہوئے تھانیدار سے کہا۔

"میرے پڑوسی نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے رات کو زور سے ریڈیو بجانے پر آئندہ اُسے ٹوکا تو وہ اپنی ٹانگ سے میرا سر توڑ دے گا۔"

"مگر وہ ٹانگ سے آپ کا سر کیسے توڑ سکتا ہے؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"اُس کی ایک ٹانگ لکڑی کی ہے۔" اُن صاحب نے اطلاع دی۔

سیّد قیصر عباس فریدی ۔ کراچی

کوئی ہے جو میری مدد کرے

ایک بھکاری ایک عالیشان بنگلے میں داخل ہوا تو فوراً ہی اس کی مڈبھیڑ گھر کی مالکہ سے ہوگئی۔ جس نے غرّا کر کہا "تم اندر کیوں آئے ؟"

بھکاری نے عاجزی سے سر جھکایا اور اپنی ہتھیلی پر رکھا ہوا بٹن گھر کی مالکہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "اگر زحمت نہ ہو تو اس بٹن پر ایک کوٹ ٹانک دیں۔"

محمد عمران بھٹی —— کاہنہ نو لاہور

ایک عرب نے کوئی سستا گھوڑا خریدا گھوڑا خرید کر وہ جانے لگا تو اُس نے تاجر سے سوال کیا۔ "بھئی سچ سچ بتادو۔ اس میں کوئی عیب تو نہیں ہے؟"

تاجر نے کہا۔ "بخدا کوئی عیب نہیں ہے۔ صرف ایک پاؤں میں کھجور کے برابر زخم ہے۔ پیٹ میں انگور کے برابر گٹھلی ہے۔ پشت پر نارنگی کے برابر پھوڑا ہے۔ اور پٹھے پر اخروٹ کے برابر معمولی سا گھاؤ ہے۔"

عرب بولا "گدھے، تو گھوڑے بیچتا ہے یا میوے؟"

شفیق الرحمن کھاکھی —— بہاولپور

بیوی (خاوند سے) "آج صبح جو آپ چھ انڈے لائے تھے، اُن میں سے چار بطخ کے تھے۔"

خاوند: "تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ وہ بطخ کے انڈے ہیں؟"

بیوی: "اب میں ایسی بھی کم عقل نہیں ہوں پانی میں ڈالے تو بطخ کے انڈے تیرنے لگے اور مرغی کے ڈوب گئے۔"

شیخ وقار علی —— لاہور

مرزا غالب کے ایک دوست کسی دوسرے شہر سے ملنے کے لئے آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ شہر میں گدھے بہت ہیں تو انہوں نے کہا "مرزا صاحب! آپ کے شہر میں گدھے بہت ہیں۔"

مرزا صاحب فوراً بولے "جی نہیں دوسرے شہر سے آجاتے ہیں۔"

اطہر ضیاء —— مقام نامعلوم

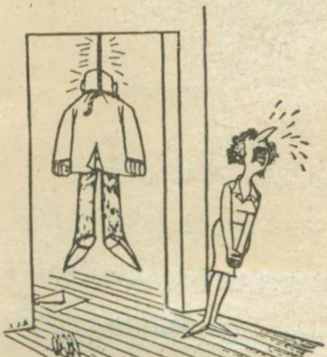

خودکشی کے لئے میرا پرانا دوپٹہ لے لیا ہوتا۔ ہائے میرا نیا دوپٹہ۔

مہمان: "بھئی اپنی بیگم سے کہو کہ شربت وغیرہ نہ بنائیں۔"

میزبان: "وہ شربت تو نہیں بنا رہیں۔"

مہمان: "تو پھر وہ برف کیوں توڑ رہی ہیں؟"

میزبان: "بھئی گرمیاں ہیں نا۔ وہ ٹھنڈے پانی سے برتن دھوئیں گی۔"

تجمل الیاس —— سمن آباد لاہور

انعامی لطیفہ

باپ نے طیش میں آتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا "میں نے اپنا عیش و آرام غارت کیا۔ دن رات محنت و مشقت کرکے تمہیں میڈیکل کی تعلیم دلوائی اور اب جب کہ تم ڈاکٹر بن گئے ہو تو تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں سگریٹ پینا چھوڑ دوں، تمہیں شرم نہیں آتی"۔

فرزانہ بتول ۔ پشاور

ایک نوجوان کو ٹرین میں جگہ نہ ملی تو بھیڑ میں دھکّے کھاتا سیدھا آخری ڈبے میں پہنچا اور اُونچی آواز میں بولا "یہ ڈبہ ٹرین کے ساتھ نہیں جا رہا ہے آپ سب مسافر دوسرے ڈبوں میں فوراً اپنی جگہ بنالیں"۔ ذرا دیر میں پورا ڈبہ خالی ہوگیا۔ نوجوان اپنی ذہانت پر مسکرایا اور خالی ڈبے میں پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔

گارڈ نے جھنڈی دکھائی۔ انجن نے سیٹی بجائی ٹرین حرکت میں آئی۔ لیکن آخری ڈبہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ نوجوان حیرت زدہ ہوکر اس معاملے کا کھوج لگانے اُٹھا تو اسٹیشن ماسٹر کا مسکراتا ہوا نظر آیا۔ اُس نے نوجوان سے پوچھا۔ "کیا تم ہی وہ ذات شریف ہو، جس نے کہا تھا کہ یہ ڈبہ گاڑی کے ساتھ نہیں جائے گا۔؟"

جواب ملا "جی ہاں"

اسٹیشن ماسٹر نے کہا "تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ ڈبہ گاڑی کے ساتھ نہیں جا رہا ہے۔ جب تم یہ ہدایت دے رہے تھے۔ تو ایک قلی یہیں موجود تھا۔ وہ سمجھا تم کوئی ریلوے افسر ہو اور اس نے ڈبے کو ٹرین سے جدا کردیا"۔

محمد علی ——— رشید آباد، کراچی

بیٹا: "ابا جان، میرے سینگ ہونے چاہئیں تھے، نا؟"

باپ "کیوں؟"

بیٹا "ماسٹر صاحب کہتے ہیں، تم اللہ میاں کی گائے ہو۔!"

صائمہ یونس ——— گرومندر کراچی

ماما! جانے کیوں آپ پریشان نہیں دکھی جاتیں

دو دوست آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ پہلا دوست بولا "میرے ابو کا نشانہ اتنا اچھا ہے کہ ایک بار انھوں نے مٹکے کا نشانہ لے کر فائر کیا تو پانی گر گیا اور مٹکا لٹکا رہا۔" یہ سُن کر دُوسرا بولا "میرے ابّو کا نشانہ اتنا اچھا ہے کہ اُنھوں نے ایک بار مٹکے کا نشانہ لے کر فائر کیا تو مٹکا گر گیا مگر پانی لٹکا رہا"

ولی محمد ۔ لانڈھی کراچی

ماں نے بچے کو انگلستان کی تاریخ پڑھاتے ہوئے بتایا
"اگرچہ نام بادشاہ کا ہوتا ہے، لیکن سارا اختیار پارلیمنٹ کے پاس ہوتا ہے۔"
بچے نے معصومیت سے سر ہلاتے ہوئے کہا: "تو پھر آپ پارلیمنٹ ہوئیں اور ابو بادشاہ۔"

اِرم غزل۔ ناظم آباد کراچی

ایک دیہاتی کسی فیشن ایبل ہوٹل میں چائے پینے کی غرض سے جا پہنچا۔ ویٹر چائے کی چھوٹی پیالی میں چائے لے آیا۔ دیہاتی نے ایک گھونٹ میں چائے ختم کر دی اور بولا
"بھئی میٹھا ٹھیک ہے، چائے لے آؤ۔"

مشہود شہزاد، نارتھ ناظم آباد

ایک شخص کو لائبریری سے کتابیں چرانے کی عادت پڑ گئی۔ اور یہ عادت اتنی بڑھی کہ لائبریری خالی ہو گئی۔ ایک دن لائبریرین ان کے گھر آیا اور کہنے لگا۔ "اگر اجازت ہو تو لائبریری کا بورڈ اتار کر آپ کے گھر پر لٹکا دوں۔"

راؤ محمد عاطف خان ۔ جمشید روڈ، کراچی

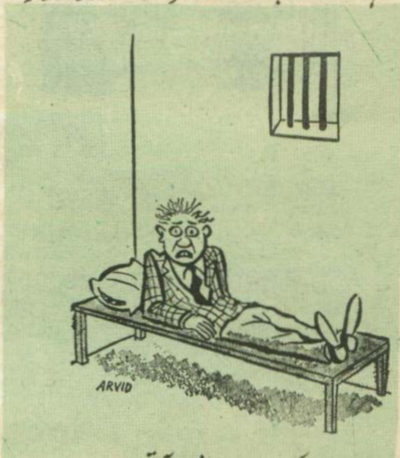

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ایک نئے نئے امیر ہونے والے آدمی سے اُس کے ایک بہت پُرانے غریب دوست کی ملاقات ہوئی تو غریب دوست نے پوچھا۔
"کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟"
"میں فضول لوگوں کو نہیں پہچانتا۔" امیر آدمی نے جواب دیا۔
"مگر میں پہچانتا ہوں۔" غریب دوست نے ہولے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

ممتاز احمد قریشی ۔ ٹھٹھہ

ایک شخص اپنے دوست کے ہاں مہمان ہُوا۔ دونوں دوست ایک کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ مٹی کی بنی ہوئی پُرانی چھت پر کسی کے چلنے سے چھت ہلنے لگی، مہمان دوست نے گھبرا کر چھت کی طرف دیکھا تو میزبان نے کہا۔
"گھبراؤ نہیں چھت اللہ کو یاد کر رہی ہے۔"
"آپ نے بجا فرمایا اسی لیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں چھت اللہ کو یاد کرتے کرتے سجدے میں نہ چلی جائے۔" مہمان دوست نے جواب دیا۔

سید عبدالرشید ۔ نواب شاہ

نیوی کی ملازمت کے لیے ایک نوجوان سے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا گیا۔
"اگر سمندر میں طوفان آجائے تو تم کیا کرو گے؟"
"میں فوراً لنگر ڈال دوں گا!"
"اگر ایک اور طوفان آجائے؟"

"تو میں ایک اور لنگر ڈال دُوں گا۔"

"اگر ایک اور طوفان آجائے۔"

"تو میں ایک اور لنگر ڈال دُوں گا۔"

"مگر تم اتنے لنگر کہاں سے لاؤ گے؟"

"جہاں سے آپ اتنے طوفان لائیں گے۔" نوجوان نے جواب دیا۔

شاندانہ امان۔ کراچی

کسی بیوقوف نے ریڈیو خریدا۔ جب گیارہ بجے ریڈیو بند ہوا تو اس نے غصّے سے ریڈیو زمین پر دے مارا۔ جس سے سیل باہر آگرے وہ سیل دیکھ کر کہنے لگا۔ "میراثی ڈھولک یہاں رکھ گئے۔ اور خود ناشتہ کرنے چلے گئے"،،

صائمہ یونس ـــــــــــــ گرومندر کراچی

ایک خاتون (دوسری خاتون سے) "بہن تم مٹھائی کا ڈبہ غسل خانے میں کیوں رکھ رہی ہو؟"

دوسری خاتون: "یہی تو ایک جگہ ہے جہاں ننھا کئی کئی ہفتے داخل نہیں ہوتا۔"

خالد ریاض ماھی ۔ حافظ آباد

اُستاد: "جگہ جگہ جلتی سگریٹ نہ پھینکو، امریکہ کی آتشزدگی یاد کرو۔ اسی طرح کا کوئی اور جُملہ بنا کر دکھاؤ۔"

شاگرد: "جگہ جگہ مت تھوکو، بنگال کا سیلاب یاد کرو۔"

عمر اختر بلوچ ۔ راولپنڈی

ماہانہ مقابلۂ معلومات

سوال در سوال

اسامہ بن سلیم

"سوال در سوال" میں آپ کی غیر معمولی دلچسپی ہمارے گمان کو اس یقین میں بدلتی ہے کہ آپ کو ماہانہ مقابلۂ معلومات کا یہ انداز پسند آیا۔ اس بار بھی لاتعداد ساتھی اپنے جوابات کے ساتھ اس مقابلے میں شریک تو ہوئے۔ مگر بدقسمتی سے بہت کم ساتھی ایسے تھے جنہوں نے تمام جوابات درست بھجوائے۔ ہمیں آپ سے یہ کہنا ہے کہ جواب بھجوانے میں عجلت سے کام نہ لیجیے۔ بلکہ اپنے دوست احباب، والدین یا اساتذہ کو اپنے جوابات دکھا کر یہ تسلی کر لیجیے کہ آپ کے تمام جوابات درست ہیں؟

اس مقابلے میں شرکت کا طریقہ تو آپ کو یاد ہو گیا ہوگا۔ تاہم ایک بار پھر جان لیں کہ آپ کو کوپن نما صفحے کے چھوٹے خانوں میں تمام سوالات کے درست جوابات لکھنا ہیں۔ جب آپ تمام جوابات لکھ چکیں تو پھر غور کریں کہ پہلے جواب کا دوسرے سے اور دوسرے کا تیسرے سے کیا تعلق ہے؟ تمام جوابات کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ جو تعلق بھی آپ کے نزدیک اہم اور مضبوط ترین ہو اُسے آپ مستطیل نما لمبے خانے میں لکھ کر کوپن ہمیں ماہِ رواں کی ۲۵ تاریخ تک بھجوا دیں۔ کوپن کے بغیر شرکت ممکن نہ ہوگی۔

تمام درست جوابات کی صورت میں ہم ہر ماہ تین انعامات (بذریعہ قرعہ) سے دیتے ہیں۔ پہلا انعام سو روپے کے پرائز بانڈ جبکہ بقیہ کتب و رسائل کی شکل میں دیے جاتے ہیں۔

اپنے جوابات صاف اور خوش خط لکھیں۔ کوپن کو بھی احتیاط سے کاٹیں۔

انعامات حاصل کرنے والے مندرجہ ذیل تینوں خوش نصیب ساتھیوں کو ادارہ مبارک باد پیش کرتا ہے۔

تین خوش نصیب جو قرعہ اندازی کے ذریعے انعام کے حق دار قرار پائے۔

(۱) اللہ دتہ عطیل، ضلع خانیوال (۲) ذوالقرنین، نئی آبادی - سرائے عالمگیر

(۳) عنبرین گلزار علی - گارڈن ویسٹ، کراچی

ایک غلطی والا کوئی حل ہمیں موصول نہیں ہوا۔

دو غلط جواب ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام۔

○ تنویر احمد خان، فیصل آباد ○ حسن رشید صدیقی، شکارپور ○ انیقہ حیدر، فیصل آباد ○ حسن مہدی خراسانی، انچولی، کراچی ○ خرم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال، کراچی ○ احسن فیروز، سمن آباد لاہور ○ اظہر سلیمان، پلندری، آزاد کشمیر۔

سوالات

① ویلنتینا نکولا یئوا تریشکووا ایک مشہور خاتون کا نام ہے ۔ کیا آپ ان کی وجہ شہرت بتا سکتے ہیں ؟

② خلاء میں جانے والے پہلے مواصلاتی سیارے کا نام اسپٹنک I تھا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اسپٹنک I کا تعلق کس ملک سے تھا؟

③ سوویت یونین کی جمہوریہ ازبکستان کے صدر مقام کا نام بتائیے ؟

④ مشہور ہندوسیاسی رہنما ضلع بنارس کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ تاریخ وفات ۱۰ ر جنوری ۱۹۶۶ء نام اور وفات کے وقت سرکاری مرتبہ بتائیے ؟

⑤ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں چین نے کس ملک کو سرحدی تنازعہ کی ایک جنگ میں شکست دی تھی ؟

⑥ جنوب مشرقی ایشیا کا ایک ملک جو ۱۹۴۸ء میں آزاد جمہوریہ بنا ۔ اس کے پہلے وزیراعظم یُو نو تھے ۔ ملک کا نام بتائیے؟

⑦ مغل بادشاہ جو اُردو کے خوبصورت شاعر بھی تھے ۔ زندگی کے آخری دن سخت اذیت میں گزارے ۔ ان کا نام بتائیے ؟

⑧ اس مخصوص گروہ کا نام بتائیے جو سیاسی عزائم کے ساتھ تاجروں کے بھیس میں ہندوستان آیا اور بالآخر عنانِ حکومت پر قابض ہو گیا ۔

⑨ جنرل ڈائر کے حکم پر سینکڑوں حریت پسندوں کی ہلاکت کا واقعہ مشرقی پنجاب کے ایک شہر میں پیش آیا ۔ یہ سانحہ تاریخ میں کس نام سے مشہور ہے ؟ بتائیے ۔

⑩ سکھوں کی مشہور عبادت گاہ گولڈن ٹیمپل بھارت کے کس شہر میں واقع ہے ؟

جوابات "سوال در سوال"

نمبر ۲ ماہ اگست ۸۸ء

۱ دنیا کا سب سے بلند اور سب سے پست مقام، دونوں براعظم ایشیا میں ہیں۔

۲ دنیا کی سب سے لمبی ریلوے لائن روس میں ہے۔

۳ ہندوانہ رسم "ستی" کا واقعہ کچھ عرصہ قبل بھارت میں پیش آیا۔ جہاں ہندوانہ عقائد کے مطابق زندہ بیوی کو مردہ شوہر کی چتا کے ساتھ جلنا پڑا۔

۴ گاندھی کی پیروکار، کانگرس کی سرگرم سیاسی رہنما مسز سروجنی نائیڈو تھیں۔ جو کچھ عرصہ یوپی کی گورنر بھی رہیں۔

۵ ۱۸۸۵ء میں اے او ہیوم اور ہندوستان کی بعض معروف شخصیات نے مل کر کانگرس کی بنیاد رکھی۔

۶ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے کانووکیشن میں اُردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے کیا تھا۔

۷ برطانیہ وہ ملک ہے جس کا آئین غیر تحریری کہلاتا ہے۔

۸ جون لوگی بیرڈ کی شہرہ آفاق ایجاد کو ہم ٹیلیوژن کے نام سے جانتے ہیں۔

۹ پاکستان کی مواصلاتی تاریخ میں ۱۹۶۴ء کی اہمیت پاکستان میں پہلے ٹی وی اسٹیشن کے قیام کی وجہ سے ہے۔ جو لاہور میں قائم ہوا۔

۱۰ ڈاکٹر جی اے الانہ علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر ہیں۔

جوابات کا باہمی تعلق

۱/۲ روس کا تعلق، براعظم ایشیا سے بھی ہے۔ روس جغرافیائی محلِ وقوع کے اعتبار سے دو براعظموں یعنی ایشیا اور یورپ میں واقع ہے۔

۲/۳ روس اور بھارت دونوں ایشیائی ممالک ہیں جو کئی باہمی دفاعی معاہدوں سے وابستہ ہیں۔ کئی بار روس کی پشت پناہی بھارت کے جارحانہ جنگی عزائم کا باعث بنی۔

۳/۴ مشہور سیاسی رہنما مسز سروجنی نائیڈو کا تعلق بھارت سے تھا۔

۴/۵ سروجنی نائیڈو کانگرس کے رہنماؤں میں سے ایک تھیں۔

۵/۶ مسلم لیگ میں شمولیت سے قبل قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کا تعلق کانگرس سے رہ چکا تھا۔

۶/۷ قائدِ اعظمؒ اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے بیرسٹری کا امتحان وہیں سے پاس کیا تھا

۷/۸ برطانیہ کے علاقے اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے سائنس دان جون لوگی بیرڈ نے ٹیلی وژن ایجاد کیا۔

۸/۹ لوگی بیرڈ کی ایجاد ٹیلی وژن کا آغاز ۱۹۶۴ء میں پاکستان کے تاریخی شہر لاہور سے ہوا۔

۹/۱۰ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے اکثر کورسز پاکستان ٹیلی وژن پر دکھائے جاتے ہیں۔

ماہانہ مقابلۂ معلوماتِ عامّہ

اکتوبر ۱۹۸۸ء

۲	۱	جواب نمبر ۱ اور ۲ کا تعلق	
۳		جواب نمبر ۲ اور ۳ کا تعلق	
۴		جواب نمبر ۳ اور ۴ کا تعلق	
۵		جواب نمبر ۴ اور ۵ کا تعلق	
۶		جواب نمبر ۵ اور ۶ کا تعلق	
۷		جواب نمبر ۶ اور ۷ کا تعلق	
۸		جواب نمبر ۷ اور ۸ کا تعلق	
۹		جواب نمبر ۸ اور ۹ کا تعلق	
۱۰		جواب نمبر ۹ اور ۱۰ کا تعلق	

مقابلے میں شرکت کے لیے کوپن کا آنا ضروری ہے۔

نام ________ مکمّل پتہ ________

حاصل کردہ نمبر

جہاں قالین وہاں صفائی

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری، کراچی

ہیڈ آفس:

عبداللہ ہارون روڈ فون: ۵۱۱۷۱۱

شاخیں:

○ بہادر آباد فون: ۴۱۳۶۹۵

○ جمشید روڈ " ۴۱۱۳۰۲

○ کھارادر " ۲۲۵۸۰۳

○ گارڈن روڈ " ۷۲۲۴۳۳

○ برنس روڈ " ۲۰۲۳۳۶

○ ڈیفنس فیز V فون: ۵۲۶۵۳۹

○ امیر خسرو روڈ " ۴۱۳۶۹۵

○ راشد منہاس روڈ " ۴۱۱۳۰۲

○ حسن اسکوائر " ۵۲۶۵۳۹

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری

ہیڈ آفس: عبداللہ ہارون روڈ، کراچی فون ۵۱۱۷۱۱ ۵۲۶۵۳۹

زونل آفس: صدر بازار۔ راولپنڈی فون ۶۷۹۸۸ ۶۳۲۵۰

جانور

شین فاروقی

جانوروں میں چھپی ہوئی غیر معمولی صلاحیتوں کا انکشاف

انسانوں کے اندر پائی جانے والی مختلف حیرت انگیز صلاحیتوں کے بارے میں تو آپ نے پڑھا ہوگا۔ اس مضمون میں ہم جانوروں اور پودوں میں پائی جانے والی بعض حیرت زدہ کر دینے والی قوتوں کا تذکرہ کریں گے۔

جنگلی جانوروں کی زندگی پر تحقیق کرنے والوں کے مطابق ہاتھی کے اندر زیرِ زمین پانی تلاش کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ گرمیوں کے موسم میں جب جنگل بارش سے طویل عرصے کے لیے محروم ہو جاتا ہے اور ندّی نالے خشک ہو جاتے ہیں تو ہاتھی زمین کھود کر پانی نکال لیتے ہیں۔ خیال ہے کہ پانی کی تلاش کے لیے جس طرح بعض لوگ چھڑی استعمال کرتے ہیں۔ ہاتھی اپنے بیرونی دانتوں کو کام میں لاتے ہوں گے!

ماہرین کے مطابق جانوروں میں انسانوں کی بہ نسبت مخصوص اشاروں کو موصول کرنے کی صلاحیت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے جانور اپنی زندگی کے لیے ایسے اشاروں پر انسانوں سے کہیں زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کبوتر جو چہرے سے بظاہر ایک معصوم یا بے وقوف پرندہ نظر آتا ہے اگر اُسے آپ اپنے گھر کے کسی چھوٹے سے ڈبے پر ایک دن بھی بٹھا دیں اور پھر اُس کو کئی سو میل دُور لے جا کر چھوڑ دیں تو یہ بڑی آسانی کے ساتھ کسی نقشے کی مدد کے بغیر اُڑتا ہوا آپ کے گھر واپس آ جائے گا۔

کبوتروں کی طرح کُتے بلیوں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بھی اگر گم ہو جائیں تو طویل فاصلہ طے کر کے

گھر پہنچ جاتے ہیں۔ آپ نے یقیناً ایسی بلّیوں کے بارے میں سُنا ہوگا جن کے مالک اُن سے پریشان ہو کر اُنہیں کئی سو میل دُور لے جاکر چھوڑ دیا اور وہ چند دنوں بعد گھر واپس آگئیں۔

کُتّے بلّیوں کے بارے میں عام خیال ہے کہ اُنھیں بہت سے واقعات کا اُن کے پیش آنے سے پہلے ہی علم ہو جاتا ہے۔ مثلاً بعض بلّیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کے مالکان جب طویل مُدّت کے لیے کہیں جانے والے ہوتے ہیں تو یہ بلّیاں اُن کے جانے سے کچھ دن پہلے غائب ہو جاتی ہیں اور جب اُن کے مالکان واپس آجاتے ہیں تو ایک دو گھنٹے بعد یہ بلّیاں واپس آجاتی ہیں۔ اسی طرح ایسے پالتو کتّے جنھیں اُن کے مالکان دن رات میں کسی وقت باہر گھمانے لے جاتے ہیں اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں اپنے گھُومنے کے وقت کا علم ہو جاتا ہے اور یہ اُس وقت پر بھونک کر یا کسی اور طرح اپنے مالک کو اطلاع دینے لگتے ہیں۔

اسی طرح آپ نے بعض ایسے پرندوں کے متعلق بھی سُنا ہوگا جو موسمی تبدیلیوں کے باعث اپنے علاقے سے ہزاروں میل دُور کے علاقے میں ہجرت کر جاتے ہیں اور جب اُن کے علاقے میں موسم اُن کے لیے سازگار ہوتا ہے تو وہ اپنے اپنے علاقوں میں واپس آجاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پرندے راستے کی تلاش کے سلسلے میں سورج یا تاروں کی روشنی سے مدد لیتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں کوئی بات سائنسی طور پر ثابت نہیں ہے۔

خشکی کے جانوروں کی طرح پانی میں رہنے والے جانوروں میں بھی بعض حیرت انگیز صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً سمندر میں رہنے والی ایک مچھلی سامن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ انڈے دینے کے لیے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے کسی دریا تک پہنچتی ہے اور وہاں انڈے دے کر پھر واپس سمندر میں چلی جاتی ہے اور جب انڈوں میں سے بچّے نکلنے کا وقت آتا ہے تو پھر اُسی دریا میں واپس آجاتی ہے جہاں اُس نے انڈے دیے تھے اور وہاں سے بچّوں کو اپنے ساتھ لے کر سمندر میں واپس چلی جاتی ہے۔ سامن کے بارے میں خیال ہے کہ یہ علاقوں کی مخصوص خوشبو سُونگھ کر اُن کے فرق کو پہچان لیتی ہے۔ اس طرح شارک مچھلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہزاروں میل پر موجود خون کی بُو کو سونگھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

چمگادڑوں کے بارے میں خیال ہے کہ وہ ایسی مدّھم آوازیں سُن سکتے ہیں جنھیں انسان نہیں سُن سکتے۔ اُلّو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ رات میں دُور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خیال ہے کہ ان تمام جانوروں کے اندر مخصوص قسم کے ایسے اشارے وصول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ جس کے بارے میں ہمیں علم نہیں، لیکن ممکن ہے کہ آئندہ برسوں میں ہم ان کے بارے میں کچھ جان جائیں۔

ایک قتل جس پر جانوروں کی دنیا میں ہنگامہ بپا ہو گیا

احمد حاطب صدیقی

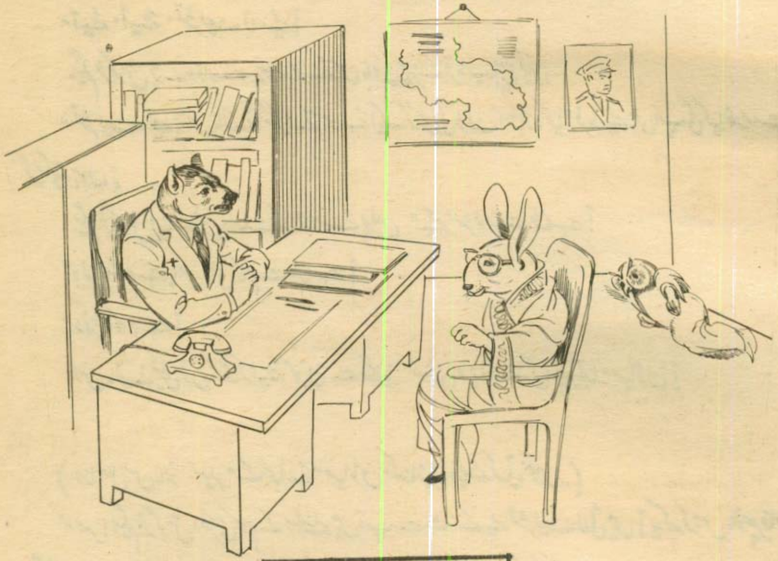

پہلا حصّہ

اور پنکی قتل کر دی گئی

"لومڑ لمیٹڈ ــــــــ پرائیویٹ سراغ رساں"

کا بورڈ دُور ہی سے نظر آ گیا۔ بیگم خرگوش نے، جو سڑک پر فرّاٹے بھرتی چلی جا رہی تھیں اپنی رفتار کم کر دی۔ اور دفتر کے قریب آ کر رُک گئیں۔ پہلے انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر دفتر کی طرف نِگاہ ڈالی۔ شیشے کے دروازے کے پیچھے "دفتر کھُلا ہے" کا بورڈ لگا ہُوا تھا۔ انھوں نے دروازہ کھول اور اندر داخل ہو گئیں۔ سامنے ہی ایک

بڑی سی میز کے پیچھے مسٹر لومڑ (پرائیویٹ سُراغ رساں) کی پرائیویٹ سیکریٹری مس مانو بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے چھوٹا سا ٹائپ رائٹر رکھا ہُوا تھا۔ دائیں جانب ٹیلی فون اور بائیں جانب کچھ فائلیں۔

بیگم خرگوش داخل ہوئیں تو مس مانو اپنے گلے میں بندھے ہوئے سُرخ ربن کو ٹھیک کر رہی تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے بیگم خرگوش کو دیکھ کر ٹھٹکیں۔۔۔ پھر مُسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔

"آیئے، آیئے، تشریف لائیے!"

بیگم خرگوش بڑے وقار سے چلتے ہوئے مس مانو کی میز کے قریب پہنچ گئیں۔

"تشریف رکھیے!" مس مانو نے مُسکراتے ہوئے ایک کُرسی کی طرف اشارہ کیا "فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

بیگم خرگوش اپنا سانس درست کرتے ہوئے بولیں "مجھے مسٹر لومڑ سے ملنا ہے!"

"دفتر کا کام ہے یا کسی ذاتی کام سے ملنا ہے؟"

"دفتر کا کام ہے!"

مس مانو نے ٹیلی فون اُٹھا کر اپنے کان سے لگایا، تھوڑی دیر انتظار کیا پھر کہا "میاؤں!"

(دراصل مس مانو "ہیلو" کے بجائے "میاؤں" کہنا زیادہ پسند کرتی تھیں۔)

"سر! بیگم خرگوش دفتری کام کے سلسلے میں آپ سے ملنے کے لیے تشریف لائی ہیں!" یہ کہہ کر مس مانو پھر خاموش ہو گئیں، غور سے کچھ سُنا اور کہا "جی اچھا" پھر ٹیلی فون کا ریسیور رکھ کر کہا:

"معاف کیجیے گا آپ کو کچھ دیر انتظار کی زحمت اُٹھانی ہوگی، کیونکہ مسٹر لومڑ ابھی کسی بہت اہم کیس پر غور کر رہے ہیں!"

بیگم خرگوش نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور کہنے لگیں۔

"مجھے ذرا جلدی ہے، لیکن خیر! میں انتظار کر لوں گی۔"

دیوار پر ایک طرف نقشہ لگا ہُوا تھا، اور دوسری طرف "اشتہاری جانوروں" کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ مسٹر لومڑ نے کھڑے ہو کر بیگم خرگوش کا استقبال کیا اور انھیں سامنے صوفے پر تشریف رکھنے کو کہا۔ بیگم خرگوش بیٹھ گئیں تو مسٹر لومڑ تھوڑی دیر اُن کا جائزہ لیتے رہے۔ ان کا رنگ بالکل سفید بُرّاق تھا۔ آنکھیں گلابی، نرم نرم ہاتھ پاؤں اور چہرے پر بے حد معصومیت

بیگم صاحبہ نے ایک شال اوڑھ رکھی تھی اور آنکھوں پر گول فریم کی نظر کی عینک لگائے ہوئے تھیں۔ ایک نظر میں اُن کا جائزہ لے کر مسٹر لومڑ نے اُن سے سوال کیا "فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں!"

"میری نواسی پنکی کل سے غائب ہے"

بیگم خرگوش یہ بات کہتے ہوئے پہلے تو روہانسی ہوگئیں پھر سسکیاں بھرنے لگیں۔ مسٹر لومڑ نے اپنی میز کے پائے پر لگے ہوئے بٹن کو دبا کر گھنٹی بجائی، چپراسی کچھوا دروازہ کھول کر داخل ہُوا۔ مسٹر لومڑ نے اس سے کہا،

"بیگم صاحبہ کے لیے پانی لائیے!"

بیگم خرگوش پانی پی چکیں تو ذرا جذبات پر قابو پایا۔ کہنے لگیں:-

"مسٹر لومڑ! کسی طرح آپ میری نواسی کو ڈھونڈ لائیں، میں اُس کے بغیر بہت اُداس ہوں!"

"مس پنکی کب سے غائب ہیں؟"

"کل سے!"

"میرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بھٹ سے کب تشریف لے گئی تھیں، کس وقت؟"

"شام کو!"

"آپ نے پولیس میں رپورٹ کروائی؟"

"جی نہیں، میں یہ نہیں چاہتی کہ میری پنکی کو پولیس پکڑ کر لائے، ویسے بھی وہ انسپکٹر بھوؤ بھوؤ کی شکل دیکھ کر ڈرتی ہے!"

"آپ کو رپورٹ تو فوراً لکھوانی چاہیے تھی، کل رات ہی کو، جب مس پنکی گھر نہیں لوٹیں۔ خیر، یہ بتائیے کہ ان کا حُلیہ کیسا ہے؟"

بیگم خرگوش نے اپنا پرس کھول کر پہلے تو ایک گلابی رنگ کا رومال نکالا۔ اپنا گول گول چشمہ اُتار کر آنسو پونچھے، پھر پرس ہی میں سے ایک تصویر نکال کر انسپکٹر لومڑ کو تھما دی۔

مس پنکی کا رنگ بھی سفید تھا، آنکھیں اور ہونٹ گلابی تھے۔ مسٹر لومڑ کو اُن میں اور دوسرے خرگوشوں میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہُوا، یہ ویسی ہی تصویر تھی جیسی کہ عام طور پر کسی بھی خرگوش کی ہوتی ہے۔

"مس پنکی کی عمر کیا ہے؟" مسٹر لومڑ نے تصویر کے پیچھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو صرف اٹھارہ ماہ کی ہے!"

بیگم خرگوش کا یہ جواب سُن کر مسٹر لومڑ چونک گئے، پھر سنبھل کر پوچھا "آپ کے خیال میں مس پنکی کو کہاں ہونا چاہیے؟"

"کیا کہہ سکتی ہوں؟ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں کسی بدمعاش درندے نے اُسے پھاڑ نہ کھایا ہو!"

"عام طور پر مس پنکی شام کے وقت کہاں جایا کرتی تھیں ؟"

"شام کے وقت وہ عموماً اپنی سہیلیوں کے ساتھ مینڈک ٹرٹر کے تالاب پر جایا کرتی تھی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ مینڈک ٹرٹر نے اپنے تالاب کے کنارے، جس کو اُس نے اب سوئمنگ پُول بنالیا ہے، ایک ریستوران بھی کھول لیا ہے۔ پنکی اور اس کی سہیلیاں شام کو اس سوئمنگ پُول کے گرد ہری ہری گھاس پہ چہل قدمی کرتی تھیں۔"

"اوہ !" مسٹر لومڑ اُچھل کر کھڑے ہوگئے، اور بولے "نانی اماں! پھر تو ہمیں فوراً چلنا چاہیئے، لیکن ٹھہریے پہلے میں پولیس کو رپورٹ کردوں" یہ کہہ کر وہ انسپکٹر بھَوُ بھَوُ کے آفس کا نمبر ملانے لگے۔

مینڈک ٹرٹر کے ریستوران پہنچ کر مسٹر لومڑ نے ریستوران کے گہرے سبز رنگ کے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا اور داخل ہوگئے۔ بیگم خرگوش اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ چُوچُو چوہا جس کی ڈیوٹی تو ریستوران کا دروازہ کھولنے اور بند کرتے رہنے کی تھی، اُس وقت کہیں غائب ہوگیا۔ دوڑتا ہوا تیزی سے مسٹر لومڑ اور بیگم خرگوش کے پاس آیا۔

"آیئے آیئے، اِدھر بیٹھیے اس میز پر۔"

"ہٹ جاؤ ہم بیٹھنے نہیں آئے، یہ بتاؤ کہ پنکی کہاں ہے ؟" مسٹر لومڑ نے اُسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

"کون پنکی ؟ چُوچُو چوہے نے حیرت سے پوچھا۔

"میری بہت بہت بہت پیاری نواسی۔" بیگم خرگوش نے بتایا۔

"اتنی پیاری نواسی تو یہاں کوئی نہیں آئی۔" چُوچُو چوہے نے جواب دیا۔

"مینڈک ٹرٹر کہاں ہے ؟" مسٹر لومڑ نے پوچھا۔

"باس اپنے دفتر میں ہیں۔" چُوچُو چوہے نے جواب دیا۔

مسٹر لومڑ نے مینڈک ٹرٹر کے دفتر کا سبز دروازہ کھولا، بیگم خرگوش اُن کے پیچھے پیچھے تھیں۔ "ٹرٹر ریسٹورنٹ" کے مالک مسٹر ٹرٹر اپنی شاندار میز کے پیچھے تشریف رکھتے تھے۔ انھوں نے گہرے سبز رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ سبز قمیص، سبز پتلون سبز ٹائی، سبز موزے اور انگلیوں میں زمرد کی سبز انگوٹھیاں۔

"کیا بات ہے ؟" مینڈک ٹرٹر اپنی تقریباً سبز آواز میں بولا۔

"مس پنکی کہاں ہیں ؟" مسٹر لومڑ نے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

"کون مس پنکی ؟" مینڈک ٹرٹر نے پوچھا۔

"میری بہت بہت بہت پیاری نواسی۔" بیگم خرگوش نے جواب دیا۔

"یہاں کوئی مس پنکی نہیں آئیں۔" مینڈک ٹرٹر اُچھل کر ٹرّایا!

مسٹر لومڑ نے کونے میں رکھا ہوا ایک بڑا سا تھیلا اُٹھایا مگر وہ جھٹ اُوپر اُٹھ گیا۔ وہ اتنا ہلکا تھا کہ اس میں کسی خرگوش کے ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ اتنے میں مسٹر اُلو وہاں آپہنچے، ان کو دن میں دکھائی تو دیتا نہیں، آواز سے مسٹر لومڑ کو پہچانا اور پوچھا

"ارے مسٹر لومڑ پرائیویٹ سُراغ رساں، تم یہاں کیا کر رہے ہو ؟"

"سُراغ لگا رہا ہُوں !"

"کس بات کا سُراغ لگا رہے ہو ؟"

"مس پنکی کے پُراسرار طور پر غائب ہو جانے کا"

"کون مس پنکی ؟"

"میری بہت بہت بہت پیاری نواسی" بیگم خرگوش بولیں۔

"اچھا چلو میں بھی تمھاری مدد کروں گا۔ میں آوازیں پہچانتا ہوں۔"

مسٹر لومڑ ریستوران کے ہال میں داخل ہو گئے، ان کے ساتھ بیگم خرگوش، مینڈک ٹرٹر اور مسٹر اُلو بھی تھے۔ ہال میں یُوں تو اندھیرا تھا۔ مگر مسٹر ٹرٹر نے شیشے کے مرتبانوں میں جگنوؤں کو پکڑ کر بند کر رکھا تھا۔ جب وہ چمکتے تو پورے ہال میں اُجالا سا ہو جاتا اور جب بجھتے تو اندھیرا پھیل جاتا۔

ریستوران کی پہلی منزل سے مسٹر سارس لم ڈھینگ اُترتے ہوئے نظر آئے۔ مسٹر لومڑ نے کڑک کر پوچھا "تم نے مس پنکی کا کیا کیا ؟"

"میرے خیال میں، مسٹر لومڑ کا خیال یہ ہے کہ مس پنکی کو کسی نے قتل کر دیا ہے" چُوچُو چوہا بہت دیر بعد بولا۔

"مسٹر لومڑ کا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے !" مسٹر ٹرٹر، ٹرٹرائے۔

"ہاں میرا خیال غلط ہو سکتا ہے، مگر غلط ہے نہیں" مسٹر لومڑ نے کہا اور پھر زوردار آواز میں مسٹر سارس لم ڈھینگ سے پوچھا "تم نے مس پنکی کا کیا کیا ؟"

"کون مس پنکی ؟" مسٹر سارس لم ڈھینگ نے پوچھا۔

"میری بہت بہت بہت پیاری نواسی" بیگم خرگوش بول پڑیں۔

"مس پنکی کو کس نے قتل کیا ہے ؟" مسٹر لومڑ مزید غصّے میں دھاڑے۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ مس پنکی قتل ہو گئی ہے" مسٹر سارس لم ڈھینگ نے پوچھا۔

"ایسے ۔۔۔" یہ کہہ کر مسٹر لومڑ نے سیڑھیوں کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے سے اسٹور رُوم میں سے ایک سفید خرگوش کی لاش نکال کر ہال کے سبز قالین پر اُچھال دی۔

"پنکی ؟ !!!" بیگم خرگوش پھُوٹ پھُوٹ کر رو پڑیں۔

عقیل عبّاس جعفری

گنی چُنی مُعلومات

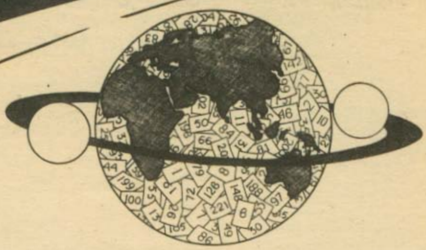

اعداد کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دُنیا کی اہم شخصیات ہوں یا بڑے بڑے واقعات، ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح اعداد سے ضرور بنتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے دُنیا بھر کی اہم معلومات پر مبنی یہ سلسلہ ہم ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ۱ کے عدد سے شروع ہونے والا سلسلہ دیکھیے کہاں تک جاتا ہے۔

(۲۸)

- فیض احمد فیض کا پہلا شعری مجموعہ نقشِ فریادی ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۸ برس تھی۔
- ریمبراں کی شہرۂ آفاق پینٹنگ دی نائٹ واچ میں ۲۸ چہروں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔
- مشہور تاریخی ناول نگار سر والٹر اسکاٹ نے ۲۸ تاریخی ناول تحریر کیے تھے۔
- جیبریل فارن ہائیٹ نے ۱۷۱۴ء میں فارن ہائیٹ تھرمامیٹر ایجاد کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال تھی۔
- ابنِ بطوطہ نے ۲۸ برس سیّاحت کی تھی۔
- دنیا کا سب سے بڑا جاندار بلیو وہیل کو سمجھا جاتا ہے۔ اس کا وزن ہاتھی کے وزن سے ۲۸ گُنا زیادہ ہوتا ہے۔
- چوہدری رحمت علی نے اپنے کتابچے "ابھی یا کبھی نہیں" میں پہلی مرتبہ لفظ پاکستان پیش کیا۔ یہ کتابچہ ۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا تھا۔
- الزبتھ بلیک ویل، دنیا کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری حاصل کی۔ اس وقت ان کی عمر ۲۸ برس تھی۔

● میکسیکو میں ۲۸، ریاستیں ہیں۔
● ٹیسٹ کرکٹ میں اگر کوئی کھلاڑی سب سے پہلے کھیلنے جائے اور آخر تک آؤٹ نہ ہو تو اُسے اصطلاحاً بیٹ کیری کرنا کہتے ہیں۔ نذر محمّد اور مدثّر نذر، یہ اعزاز حاصل کرنے والے واحد باپ بیٹے ہیں۔ دونوں نے یہ اعزاز بھارت کے خلاف حاصل کیا۔ مدثّر نذر کا اسکور ۱۵۲، رنز اپنے والد کے اسکور ۱۲۴، رنز سے ۲۸، رنز زیادہ تھا۔

(۲۹)

● قرآنِ پاک میں ۲۹، سورتوں کا آغاز حروفِ مُقطعات سے ہوتا ہے۔
● غیاث الدّین تُغلق نے ۲۹، معرکوں میں منگولوں کو شکست دی تھی۔
● مغربی برلن کا رقبہ مشرقی برلن کی بہ نسبت ۲۹، مرّبع میل زیادہ ہے۔
● فٹ بال کے مشہور کھلاڑی پیلے نے اپنا ہزارواں گول ۱۹، نومبر ۱۹۶۹ء کو اسکور کیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۹، برس تھی۔
● افریقہ کا ۲۹ واں انقلاب ۲۹، جولائی ۱۹۷۵ء کو الجزائر میں رُونما ہوا تھا۔
● عربی زبان میں ۲۹، حروفِ تہجّی ہیں۔
● لارڈ بیڈن پاول ۱۹۱۲ء میں چیف اسکاؤٹ آف دی ورلڈ مقرّر کیے گئے اور پھر اگلے ۲۹ برس تک اس عہدے پر فائز رہے۔
● زمین سورج کے گرد ۶۶۶۲۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گردش کرتی ہے جو چاند کی زمین کے گرد گردش کی رفتار سے ۲۹، گُنا زیادہ ہے۔
● ۷، دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپان نے امریکہ کے بحری اڈّے پرل ہاربر پر حملہ کرکے اسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس حملے میں جاپان کے ۲۹، ہوائی جہاز تباہ ہوئے تھے۔
● دنیا میں سب سے زیادہ کافی سوئیڈن میں پی جاتی ہے۔ سوئیڈن کا ایک باشندہ سال بھر میں اوسطاً ۲۹، پونڈ کافی پی جاتا ہے۔

(۳۰)

● مولانا ابوالاعلیٰ مودُودیؒ نے قرآنِ پاک کی تفسیر "تفہیم القرآن" ۳۰، سال ۴، ماہ کے عرصے میں تحریر کی تھی۔
● سن گیارہ

• سُنیل گواسکر نے سرڈان بریڈمین کا ۲۹ سینچریوں کا ریکارڈ ۲۸ دسمبر ۱۹۸۳ء کو مدراس کے میدان میں توڑا جہاں انھوں نے اپنی تیسویں ٹیسٹ سینچری اسکور کی۔

• گھڑی کی چھوٹی سوئی ایک گھنٹے میں ۳۰ درجے کا فاصلہ طے کرتی ہے۔

• شادی کی تیسویں سالگرہ پرل جوبلی کہلاتی ہے۔

• سال میں صرف چار مہینے ایسے ہوتے ہیں جو تیس تیس دنوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ وہ مہینے ہیں اپریل، جون، ستمبر اور نومبر۔

• بانس کا پودا دنیا میں سب سے تیزی سے بڑھنے والا پودا ہے۔ وہ ایک سال میں ۳۰ میٹر بڑھ جاتا ہے۔

• وورنگ ہائیٹس کی مصنّفہ این براونٹے کا انتقال تپِ دق کے مرض میں ۱۸۴۸ء میں ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۰ برس تھی۔

• دنیا کے پہلے نیگرو عالمی ہیوی ویٹ باکسنگ چیمپئن، جیک جانسن نے یہ اعزاز ۲۶ دسمبر ۱۹۰۸ء کو صرف ۳۰ برس کی عمر میں حاصل کیا تھا۔

• خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی عمر ۳۰ برس تھی۔

کیا آپ جاننا چاہیں گے کہ

اکیسویں صدی میں یہ دنیا کیسی ہوگی؟

آئندہ صدی کی دُنیا کی ایک مکمّل اور بھرپور جھلک کے لیے ملاحظہ کیجیے **آنکھ مچولی** کا

نیا سِلسلے وار سائنسی ناول "**عکس**"

○ اکیسویں صدی کے ایک پاکستانی سائنسدان کی حیرت انگیز ایجاد کی کہانی جس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچادیا۔

○ آنے والے زمانے کا دلچسپ قصّہ جس کا موضوع اچھوتا اور خیال بالکل نیا ہے شاھنواز فاروقی کے شاعرانہ قلم نے اس ناول میں ایک ایسی عجیب وغریب دنیا تخلیق کی ہے جس کا آپ تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔

پہلی قسط پڑھنے کے لیے **نومبر ۱۹۸۸ء** کے شمارے کا انتظار کیجیے

ساحلِ سمندر

محمد امان خان دِل

ایک دن آیا سمندر میں نہانے کا خیال — اس کے ساحل پر ذرا پکنک منانے کا خیال
ہاں مگر تنہا نہیں پکنک منانے کا مزہ — دوسروں کے ساتھ ہے پکنک پہ جانے کا مزہ
اس لیے کچھ ساتھیوں کو میں نے راغب کر لیا — کار میں سامان لے جانا تھا جتنا بھر لیا
کار لے جانے کی ابّو سے اجازت مِل گئی — جلد گھر کے کام سے بھی آج فرصت مل گئی
ہم روانہ ہو گئے یار و سمندر کی طرف — چل پڑے تو مُڑ کے دیکھا بھی نہیں گھر کی طرف
پیرا ڈائز یا گڈانی آج جانا چاہیے — آج ہم سب کو وہاں جا کر نہانا چاہیے
ہم وہاں پہنچے تو دیکھا اور بھی افراد تھے — اپنی اپنی ٹولیوں میں شاد تھے آباد تھے
سامنے تھا اب ہمارے یہ سمندر موجزن — جس کی وسعت دیکھتے ہی کانپ جاتا ہے بدن
دوستو! چشمِ زدن میں ہو گیا اک حادثہ — اُف! کسی کے ڈوب جانے کی ہمیں آئی صدا
ڈُوبنے والا گیا تھا بس نہانے کے لیے — وہ بھی ڈوبا جو گیا اُس کو بچانے کے لیے
کس میں ہمت ہے کہ سرکش موج سے لے انتقام — کر چکا ہے یوں سمندر کام کتنوں کا تمام
ساتھیو! ہرگز سمندر میں نہانے کا نہیں — اس کے پانی میں اُتر کر دُور جانے کا نہیں
حادثہ اے دِل سمندر کا سبق آموز تھا — ڈُوب کر مرنے کا منظر کس قدر دلدوز تھا

کہانی کیسے لکھی جائے؟

طاہر مسعود

دو اجنبی ایک ٹرین پر سفر کر رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا "کیا تمہیں جنّ اور بھوت پر یقین ہے؟" یہ سُن کر دوسرا شخص دھواں بن کر غائب ہوگیا۔ ایڈگر ایلن پو کی یہ کہانی دنیا کی مختصر ترین کہانی سمجھی جاتی ہے۔ اس کہانی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وہ ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کسی اچھی اور دلچسپ کہانی میں ہونی چاہئیں۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایک کہانی میں کیا خصوصیات ہوتی ہیں؟ عام طور پر ایک کہانی میں درج ذیل عناصر ضروری سمجھے جاتے ہیں۔

ا۔ پلاٹ ب۔ کردار ج۔ مکالمے د۔ ماحول

پلاٹ

پلاٹ کہانی کے خاکے کو کہتے ہیں۔ جب آپ ایک کہانی لکھنے بیٹھیں گے تو ضروری ہے کہ آپ کے ذہن میں کہانی کا خاکہ واضح ہو۔ کہانی کی ابتدا، درمیان اور اس کا اختتام یعنی کلائمکس۔ کہانی کی ابتدا دلچسپ ہونی چاہیئے تاکہ پڑھنے والا فوراً متوجہ ہو جائے۔ اگر کہانی اپنی ابتدا ہی سے غیر دلچسپ اور بور ہوگی تو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکے گی۔ کامیاب کہانی کار اس گُر سے واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی کہانی کا پہلا جُملہ بہت طاقتور ہوتا ہے اور اسی جُملے سے وہ اپنے پڑھنے والوں کے جذبۂ تجسس کو بیدار کر دیتے ہیں۔ اور پڑھنے والے "اب کیا ہوگا؟" کے تجسس میں کہانی پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کہانی کی ابتدا اس جُملے سے ہو: "اس دن صبح کو جب انور اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا تو بہت خوش تھا" تو پڑھنے والے کے ذہن میں فوراً تجسس پیدا ہو جاتا ہے، وہ سوچتا ہے "انور کیوں خوش تھا؟ اس دن ایسی کیا بات ہو گئی تھی؟" اور یہ جاننے کے لیے وہ کہانی پڑھنے لگتا ہے۔

کہانی کی ابتدا اپنے اندر جتنی اہمیت رکھتی ہے اتنی ہی اہمیت اس کے اختتام کی بھی ہوتی ہے۔ اگر ایک اچھی کہانی کا اختتام اچھا نہ ہو تو پڑھنے والا بہت بدمزہ ہوتا ہے۔ اور کہانی کا سارا تاثر غارت ہو جاتا ہے۔ کہانی کو ہمیشہ کسی ایسے موڑ پر ختم ہونا

چاہیے کہ جہاں پڑھنے والا کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر کوئی کہانی اپنے قاری کو سوچنے پر نہیں اُکساتی، قاری کہانی ختم کرنے کے بعد اس کے کرداروں کے بارے میں کچھ نہیں سوچتا۔ اور کہانی کا ایک مجموعی تاثر اس کے ذہن پر مرتب نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کہانی بس یونہی سی ہے۔ ضروری نہیں کہ کہانی کے خاتمے پر قاری کو کہانی کے متعلق ہر سوال کا جواب مل جائے۔ ایک اچھی کہانی اپنے خاتمے پر معمولی سی تشنہ بھی ہوتی ہے۔ جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ پڑھنے والا خود بھی کچھ سوچ بچار کرے۔

کردار

کہانی اپنے کرداروں سے جنم لیتی ہے۔ ایسی کسی کہانی کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس میں سرے سے کردار ہی نہ ہوں۔ داستانی کہانیوں کے کردار بادشاہ، شہزادے، جادوگر، دیو، پری وغیرہ ہوتے تھے اور آج کل کی کہانیوں میں ہمارے ارد گرد کے رہنے سہنے والے لوگ کردار ہوتے ہیں۔ چونکہ ہمارے چاروں طرف ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے مختلف مزاج کے لوگ۔ آپ صرف بچّوں اور نوجوانوں کی مثال لیجیے۔ تمام بچّے اور تمام نوجوان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان کی مختلف عادات اور مختلف پسند و ناپسند ہوتی ہے۔ ان کے رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے، اُٹھنے بیٹھنے، بات چیت کرنے کے ڈھنگ ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب کہانی کار ان میں سے کسی ایک کو اپنی کہانی کا کردار بناتا ہے تو اس کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کردار کا لفظوں کے ذریعے ایسا نقشہ کھینچے کہ پڑھنے والا ایسا محسوس کرے جیسے اس کی کردار سے ذاتی ملاقات ہوئی ہو۔ اس کردار کی نفسیات اس کی سوچ کو وہ واضح طریقے سے بیان کر سکے۔ اس صلاحیت کو کردار نگاری کہتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہانی کار کے اندر کردار نگاری کی صلاحیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور اس کے لیے کیا کیا چیزیں ضروری ہوتی ہیں؟ کردار نگاری کے لیے مشاہدہ درکار ہوتا ہے۔ کہانی کار کا مشاہدہ انسانوں کے متعلق جتنا وسیع اور گہرا ہو گا وہ اتنے ہی اچھے طریقے سے اپنے کرداروں کا تعارف کرا سکے گا۔ اسی لیے کہانیاں لکھنے والے بے حد حساس اور چوکنا رہتے ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی آنکھ سے کوئی چیز بچ کر نہیں نکل سکتی۔ ان کے کان کھلے رہتے ہیں اور وہ سب کچھ سُن لیتے ہیں جن کا سننا ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ چوراہوں پر پھول بیچنے والے کسی بچّے کی کہانی لکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے محض یہ کافی نہیں ہو گا کہ آپ ایسے کسی بچّے کو پھول بیچتے دیکھیں اور کوئی کہانی گھڑ کر لکھ ڈالیں اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ایسے بچّوں کی زندگی کا بغور مشاہدہ کریں۔ ان کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ وہ کیسے ماحول میں رہتے ہیں؟ عام زندگی میں ان کا رویّہ اور برتاؤ کیسا ہے؟ وہ کیا سوچتے ہیں؟ ان کے گھریلو حالات کیسے ہیں؟ انھوں نے اس پیشے کو کیوں اختیار کیا؟ اس قسم کی بنیادی معلومات جب تک آپ کے پاس نہیں ہوں گی۔ آپ ان کے کردار کا نقشہ نہیں کھینچ سکتے۔ اور اگر آپ ایسے بچّوں سے ملے بغیر ان کے متعلق کچھ لکھیں گے تو اس میں حقیقت کا رنگ پیدا نہیں ہو گا۔ یقین جانیے کہ جب آپ ایسے بچّوں سے ملیں گے تو ہر بچّے کی زندگی میں ایک کہانی چھپی ملے گی۔ کیونکہ ہر کردار ایک کہانی ہوتا ہے۔ اصل بات صرف اندازِ نظر کی ہے کہ آپ کس نظر سے اور کتنی گہرائی سے اس کردار کو دیکھتے اور بیان کرتے ہیں۔

مکالمے

کردار اور مکالمے ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ کردار کہانیوں میں ہنستے اور بولتے ہیں۔ وہ روتے اور گاتے ہیں۔ وہ مختلف قسم کے حالات کا سامنا کرتے ہیں۔ جب کوئی کردار بولتا ہے تو وہ اپنی بات چیت سے کہانی کو آگے بھی بڑھاتا ہے اور اپنی شخصیت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ عام زندگی میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو شخص خاموش رہتا ہے اس کے متعلق آپ کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ آپ اس شخص کے بارے میں اس وقت کچھ جانتے ہیں جب وہ بول پڑتا ہے۔ کہانی میں کرداروں کا بولنا بھی ضروری ہے۔ جن کہانیوں میں کردار بولتے نہیں ہیں ان میں کہانی کار کو ان کرداروں کے متعلق بتانا پڑتا ہے۔ اور کہانی کار جب کہانی بیان کرتا ہے تو اُسے بیانیہ کہتے ہیں۔ کسی کہانی میں مکالمہ لکھتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ مکالمے جس کردار کی زبان سے ادا ہو رہے ہوں۔ وہ کردار کی بھرپور نمائندگی بھی کرتے ہوں۔ مثلاً ایک ان پڑھ دیہاتی یا گنوار موچی کے کردار کی گفتگو شائستہ اور پُرتکلف نہیں ہونی چاہیے یا ایک بچے کی بات چیت کو لازماً بڑوں کے اندازِ گفتگو سے مختلف ہونا چاہیئے۔ مکالموں سے کردار کی عمر، سماجی مرتبے اور سوچ کی سطح سبھی کچھ جھلکنا چاہیے۔ مکالمے جتنے حقیقی اور برجستہ ہوں گے کردار میں اتنی ہی جان محسوس ہوگی۔ طول طویل اور غیر ضروری مکالمے جو کہانی کو آگے نہ بڑھاتے ہوں یا کہانی میں یکسانیت پیدا کرتے ہوں ایسے مکالموں سے کہانی کار کو گریز کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں کہانی میں جب دو کردار گفتگو کر رہے ہوں تو ایسا محسوس نہیں ہونا چاہیے کہ ایک فقرہ دوسرے فقرے سے گفتگو کر رہا ہو بلکہ ایک شخص کا دوسرے شخص سے گفتگو کا تاثر ہونا چاہیئے۔ سجے سجائے اور پُرتکلف فقرے اور جملے کہانی کو حقیقت سے دُور کر دیتے ہیں۔ بہت سی کہانیاں ایسی بھی لکھی جاتی ہیں جس میں بیانیہ کم ہوتا ہے اور مکالمے زیادہ۔ اور ایسی کہانیوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں جس میں مکالمہ برائے نام ہوتا ہے یا بالکل بھی نہیں ہوتا۔ اس کا انحصار کہانی لکھنے کی تکنیک پر ہوتا ہے۔ کچھ کہانیاں خط کے پیرائے میں یا ڈائری کے انداز میں بھی لکھی جاتی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کہانی کار کسی موضوع یا واقعے کو کہانی کا روپ کس انداز میں دینا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی لگا بندھا اصول نہیں ہے۔ کچھ یہی حال مکالموں کا ہے۔ یہ بتانا کہ کسی کہانی میں مکالمے کتنی مقدار میں ہونے چاہئیں۔ بے حد مشکل ہے۔ مکالموں کا تعلق کہانی میں کرداروں کی نقل و حرکت سے ہوتا ہے۔ کہانی میں کرداروں کی سرگرمی اور عمل تیز ہوگا تو مکالمے ... بھی لامحالہ زیادہ ہوں گے۔

ماحول

ہر کہانی کسی مخصوص ماحول اور فضا میں جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہے۔ کہانی کے کردار اس ماحول کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔ ماحول سے علیحدہ ہو کر کردار اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر جب تک کہانی کار، ماحول کی تصویر کشی نہیں کرے گا کرداروں کی وضاحت اس کے لیے ناممکن ہوگی۔ اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ اکثر کہانیوں میں کہانی کار ماحول کی وضاحت میں خاصا زورِ بیان صرف کرتے ہیں۔ اگر کسی سیٹھ کا قصہ ہے تو اس کی عالیشان کوٹھی، نئی چمکیلی گاڑی، شاندار دفتر اور وہ سب کچھ دکھایا جائے گا۔

جس سے اس کی دولت اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کا اندازہ کیا جا سکے۔ کہانی میں ماحول، فضا، کیفیت ان سب کا ذکر ضروری ہے اگر شام یارات کا ذکر ہے تو یہ بتانا کہ موسم کیسا تھا۔ ماحول پرسکون تھا یا پرشور۔ ہوا چل رہی تھی یا رُکی ہوئی۔ بظاہر کہانی کی یہ جزئیات ہوتی ہیں۔ لیکن ان چھوٹی موٹی باتوں سے کہانی کی ایک فضا بنتی ہے۔ جو پڑھنے والوں پر ایک تاثر چھوڑتی ہے۔ بعض لکھنے والوں کو ماحول بیان کرنے پر اتنی قدرت ہوتی ہے کہ ان کی یہی خصوصیت ان کی پہچان بن جاتی ہے۔

کہانی کی تلاش

اب آخر میں سب سے اہم بات یہ کہ ایک کہانی کار کے ذہن میں کہانی کیسے جنم لیتی ہے؟ کیا کہانی خود بخود اس کے ذہن میں اُترتی ہے یا وہ اُسے کہیں سے تلاش کرتا ہے؟ ایک کہانی لکھنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ مطالعہ اور مشاہدہ کہانی لکھنے کے خواہشمندوں کو تمام نئے اور پرانے افسانہ نگاروں کی کہانیاں پڑھنی چاہئیں تاکہ سب سے پہلے تو اُسے کہانی کہنے کے فن سے واقفیت ہو۔ اور یہ معلوم ہو کہ کہانی بیان کس طرح کی جاتی ہے۔ اس کے بعد کہانی لکھنے والے کو اپنے گردو پیش کی زندگی اور لوگوں کا غور سے مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ معاشرے میں چاروں طرف کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کہانی لکھنے والا اپنی کہانی خود تلاش کرے۔ کوئی ایسا کردار جو اسے متاثر کرتا ہو۔ کوئی ایسا واقعہ جو اس کے ذہن کو جھنجھوڑ دے، اس کے لیے کہانی لکھنے کا محرک بن سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھیے کہ جس طرح تیراکی پر کتابیں پڑھ لینے یا تیراکی کے مقابلے دیکھ لینے سے کوئی شخص تیراک نہیں بن سکتا۔ اسی طرح صرف کہانیاں پڑھ لینے یا اس کے اصول جان لینے سے کہانی کار بن جانا بھی ناممکن ہے۔۔۔ کہانی کار بننے کے لیے ضروری ہے آپ کہانی لکھنے کی مشق شروع کر دیجیے۔ آج ہی سے۔ بلکہ ابھی سے۔

"تسلسل"

آئرلینڈ کے ممتاز سیاستدان ڈی ویرا اپنی سیاسی تقریروں کی بنا پر کئی بار گرفتار ہوئے، مگر حکومت انہیں خاموش نہ کر سکی۔ جونہی وہ جیل سے نکلتے، پہلے سے زیادہ عزم سے تقریر شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ تقریر کے دوران ہی انہیں گرفتار کر لیا گیا اور تقریر ادھوری رہ گئی۔ ایک سال بعد جب رہا ہوئے تو سیدھے اسی ہال میں پہنچے اور حاضرین سے کہا "ہاں، تو جیسا کہ میں اس روز کہہ رہا تھا..."

بشریٰ حفیظ ——— مانسہرہ (ہزارہ)

سرِورق کی کہانی

کاغذ کا گھوڑا ... کیا خوب دوڑا

گھوڑے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک اصلی اور دوسرا کاغذی۔ ہوتے دونوں گھوڑے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک کام کا گھوڑا ہوتا ہے اور دوسرا نام کا۔ ایک پر آپ بیٹھ سکتے ہیں اور دوسرے کو صرف دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک سرپٹ بھاگ سکتا ہے اور دوسرا بھاگنا تو دور کی بات، کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں بھاگنے والے گھوڑے پسند نہیں ہیں، کیونکہ یہ بھاگتے بھاگتے ہمیں اپنی پیٹھ سے گرا دیتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں گھوڑے کی پیٹھ سے گرنے کو شہسوار کی پہچان بتایا گیا ہے لیکن کلفٹن کے ساحل پر جو گھوڑے کی پیٹھ سے گر جائے اُسے اناڑی کہتے ہیں۔ ہمیں اناڑی کہلانا اچھا نہیں لگتا۔ اس سے اچھے تو کاغذی گھوڑے ہوتے ہیں۔ جنہیں خریدتے وقت کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر بعد میں ان پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا، کیونکہ کاغذی گھوڑے گھاس نہیں کھاتے، پانی نہیں پیتے، حد تو یہ ہے دولتّی بھی نہیں جھاڑتے۔ بس ہمارے ڈرائنگ روموں میں آرائش کا سامان بنے رہتے ہیں اور جب ہمارے گھر مہمان آتے ہیں تو ان کے بچّے انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں اور ہم سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ نے اسے خریدا ہے؟ یا اسے خود بنایا ہے۔ ہم کہتے ہیں اسے ہم نے بنایا نہیں جس سے ہم نے خریدا ہے اس نے ہمیں بے وقوف بنایا ہے، کیونکہ اس نے ہم سے اس کی بہت زیادہ قیمت وصول کی ہے۔ کیا آپ اسے ساتھ لے جانا پسند کریں گے؟ ہم آدھی قیمت پر اسے بیچنے کو تیار ہیں۔ یہ سُن کر بچّوں کے والدین بُرا سا منہ بناتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر ہمیں خریدنا ہی ہُوا تو ہم اصلی گھوڑے خریدیں گے۔ سارے لوگ اصلی گھوڑوں سے کیوں پیار کرتے ہیں؟ کیا کاغذی گھوڑوں کو جینے کا حق نہیں؟ حالانکہ کاغذی گھوڑے کے کتنے ہی فائدے ہیں جن سے لوگ بے خبر ہیں۔ ان گھوڑوں پر ہم اپنا نام لکھ سکتے ہیں۔ تیز بارش میں ہم انھیں پھاڑ کر کشتی بنا سکتے ہیں اگر چولہے کا ایندھن ختم ہو چکا ہو تو ہم انھیں جلا کر اس سے چائے گرم کر سکتے ہیں۔ کیا اصلی گھوڑوں سے ہمارے اتنے کام نِکل سکتے ہیں؟ یہ ہمارے نہیں آپ کے سوچنے کی بات ہے۔ کچھ اور بھی فائدے ہیں کاغذی گھوڑے کے، لیکن ہم ان فائدوں کو نہیں گنوائیں گے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح مارکیٹ میں اصلی گھوڑوں کی قیمت گِر جائے اور کاغذی گھوڑے مہنگے ہو جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارا کاغذی گھوڑا نہیں دوڑتا لیکن کیا یہ کافی نہیں کہ ہم دوڑ لیتے ہیں۔ کاغذی گھوڑے کو بغل میں دبا کے ہم دوڑتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں: "کاغذ کا گھوڑا۔ کیا خوب دوڑا"

نئی تحریریں

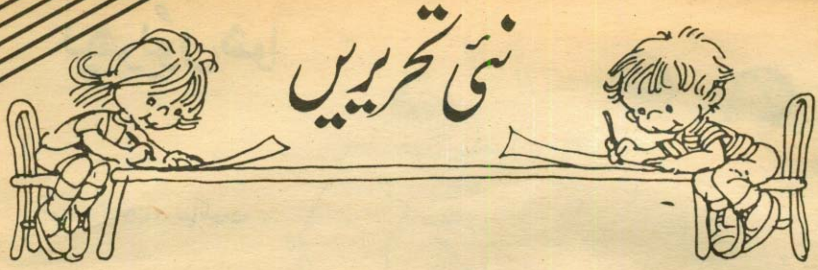

"نئی تحریریں" نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے اندر کی چھپی ہوئی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں۔ اس لیے تحریر روانہ کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھیے۔

- تحریر کاغذ کے ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر خوشخط لکھی گئی ہو۔
- تحریر نقل شدہ نہ ہو۔
- اپنا نام اور پتہ صاف صاف لکھیے۔

(ادارہ)

حمدِ باری تعالیٰ

سارے جگ کا تُو ہے والی
ہر اک تیرے در کا سوالی
میرا بیاں ہے ناقص ناقص
تیری شان ہے عالی عالی!
تیرے ذکر سے اس گلشن کی
جھوم رہی ہے ڈالی ڈالی
بخش دے میری ساری خطائیں
تیری ذات ہے بخشنے والی!
تُو پوشیدہ آنکھ سے، پھر بھی
تیری قدرت ہر سُو پالی
اُس کی بھی شہ رگ سے قریں ہے
تیری یاد سے جو دِل خالی

ندیم نیازی، جگہ نامعلوم

اچھّا بچّہ

گڈّو اچھّا بچّہ ہے — بھولا بھالا سچّا ہے
گھر بھر کا وہ پیارا ہے — سب کی آنکھ کا تارا ہے
صبح سویرے جاگتا ہے — باغ میں جاکر بھاگتا ہے
کرتا ہے دانتوں کو صاف — اپنے منہ، ہاتھوں کو صاف
پھر اسکول وہ جاتا ہے — پڑھ کر خوش خوش آتا ہے
جُھوٹ سے نفرت کرتا ہے — سب کی عزّت کرتا ہے

اس کے دوست جو بچّے ہیں
نیک ہیں سارے اچھّے ہیں

مرسلہ۔ محمد آصف اقبال۔ کراچی

پھر یوں ہوا

فرحت العین، سیالکوٹ

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابھی زوردار بارش شروع ہو جائے گی۔ ہم یعنی سارہ، فاطمہ، فرح، پپّو، عینی اور ناصر امّی کی مسلسل منّت سماجت کر رہے تھے کہ اوپر ٹیرس پر سوئیں گے۔ مگر امّی مسلسل انکار کر رہی تھیں کہ بارش ہوئی تو مجھ سے نہ کہنا۔ آخر فاطمہ باجی نے ہمّت کر کے کہہ دیا کہ اگر بارش ہوئی تو ہم ٹیرس کے ساتھ والے کمرے میں چلے جائیں گے۔ یہ دلیل سُن کر امّی نے ہتھیار ڈال دیئے اور ہم سب نے نعرہ لگایا "امّی، زندہ باد!"

ہم سب نے مل کر بستر لگائے۔ بستر لگا کر فارغ ہوتے ہی تھے کہ نیچے امّی نے کھانے کے لئے آواز دی کھانا کھا کر ہم دوبارہ اوپر آ گئے۔ اب کسی کو نیند نہ آ رہی تھی۔ سارے ٹیرس پر گھوم رہے تھے ناصر مالٹے کے چھلکے اکٹھے کئے آتے جاتے لوگوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اتنے میں ایک کتّا ہمارے گھر کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک پتھر اُٹھا کر مارا۔ پاس سے ایک راہگیر گزر رہا تھا۔ کتّا سمجھا پتھر اس نے مارا ہے۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ راہگیر نے یہ خطرناک صورتحال دیکھی تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اور سامنے والے گھر میں گھُس گیا۔ ہم نے اس راہگیر کی یہ حالت دیکھی تو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے اور وہ صاحب ہمیں وہیں سے دانت پیس کر دکھانے لگے۔ وہ بے چارے گیٹ کے اندر اور کتّا باہر پہرا دینے لگا۔ کچھ دیر تک اس منظر سے محظوظ ہونے کے بعد ہم دیوار سے نیچے اُترے تو سارہ کو کاغذ اور قینچی لئے مختلف تجربات میں مصروف دیکھا اسی طرح ہر کوئی کسی نہ کسی شغل میں مست تھا۔ کہ باجی فاطمہ نے اعلان کیا "سب لوگ سو جائیں" مگر کوئی سونے کو تیار نہ تھا۔ پھر اعلان ہوا، چھُپن چھپائی کھیلتے ہیں۔ جب ہماری باری آئی تو ہم نے سو تک گنتی گنی اور آ گئے ہمارا ٹیرس کچھ اس طرح بنا ہے کہ اس کے ساتھ ایک بہت بڑا کمرہ ہے اور اسی کمرے سے زینہ نیچے جاتا ہے۔ پھر ایک چھوٹی سی گیلری ہے ہم جب ڈھونڈنے کے لئے گیلری میں مڑے تو ہماری

ٹکر ٹپو سے ہوگئی۔ ہم ڈر گئے اور آنکھیں بند کر کے چیخنے لگے "چور، چور"، اتنے میں امّی اوپر آگئیں۔ اور غصّے سے بولیں " یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ چلو، سو جاؤ "

امّی کے آتے ہی سب بستروں میں گھس گئے ہمیں معلوم نہیں کہ بعد میں کیا ہوا۔ کیونکہ ہم سو گئے تھے۔ اچانک کسی نے ہم پر پانی پھینکنا شروع کر دیا۔ ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تو دیکھا کہ زبردست قسم کی بارش ہو رہی ہے۔ باجی نے سب کو اٹھایا، مگر جلدی اور بوکھلاہٹ میں ناصر رہ گیا۔ سب ایک دوسرے سے ٹکراتے لڑتے اندر کمرے میں سونے کے لئے آئے۔ بستر بچھائے، تو باجی کو خیال آیا کہ ناصر رہ گیا ہے۔ وہ فوراً باہر گئیں۔ اور اسے جھنجھوڑ کر اٹھا لائیں۔ اسی دوران لائٹ چلی گئی۔ ہم جو دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ ایک دم چکرا کر گر پڑے اور وہ بھی سیدھا فرح پر یوں لگا، جیسے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو فرح نے ہمیں بڑے ہمدردانہ انداز میں سیدھا کھڑا کیا اور سیدھے ہاتھ کا مکّا بنا کر طوفانی انداز میں ہماری طرف بڑھایا۔ دشمن کو حملہ آور ہوتے دیکھ کر ہم تیزی سے نیچے جھک گئے اور وہ مکّا ناصر کے پیٹ میں جا لگا۔ جو کمرے میں پلنگ لئے داخل ہو رہا تھا۔ اب جب مکّا اس کے پیٹ پر لگا تو اس کے ہاتھ سے پلنگ چھوٹ گیا اور سیدھا فاطمہ باجی کے پاؤں پر لگا،

" ہائے !" ان کے منہ سے کراہ نکلی۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور تھپڑ لگانے کے لئے جو تیزی سے ہاتھ پیچھے کیا تو تڑاخ سے عینی کو جا لگا۔ جو پیچھے کھڑی ما جرا دیکھ رہی تھی۔ ہم جو درمیان میں کھڑے اس عجیب و غریب صورتحال پر ہنس رہے تھے، ہماری ہنسی کسی کو پسند نہ آئی۔ اور سب ہماری طرف جھپٹے۔ ہم چپکے سے نکل آئے۔ اور وہ سب میرے ساتھ کھڑی فرح کو مارنے لگے۔ جب وہ چیخی تو ان کو پتا چلا۔ اب سب ایک دوسرے کو فرحت سمجھ کر مارنے لگے کہ ایکدم لائٹ آگئی تو ان کو اصل حقیقت معلوم ہوئی کہ وہ سب ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں اور ہم بڑے مزے سے دور کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ تلملا اٹھے۔ ناصر نے جوتا اٹھا کر مارا تو وہ ...... دیوار پر لگا۔

" رات کے دو بج رہے ہیں، اب سو جاؤ "

باجی بات کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے بولیں اور سب اپنے بستروں کی طرف بڑھے۔ ابھی کوئی بھی اپنے پلنگ تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ کسی کا ہاتھ سوئچ سے لگا۔ اور ... لائٹ بند ہوگئی۔ اور اے سی چلنے لگا۔ سب ٹھنڈ سے کانپنے لگے۔ مگر یہ بات کوئی بھی ماننے کو تیار نہ تھا کہ اے سی چل رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں سچ مچ لائٹ ہی چلی گئی اور سب سو گئے۔

صبح جب ہماری آنکھ کھلی تو ان سب کا حال دیکھا کہ سارہ، باجی کی ٹانگوں ساتھ لپٹی ہوئی تھی، ناصر زمین پر پلنگ کے پائے پکڑے سویا ہوا تھا اس کا گال سوجا ہوا تھا۔ عینی اپنے پلنگ پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی کہ تکیہ سر کے بجائے پیروں کے نیچے پڑا تھا۔ فرح نے اپنا سر سارہ کے پیٹ پر رکھا ہوا تھا اور اس کا ایک پاؤں سوجا ہوا تھا، سب کا کچھ ایسا ہی حال

تھا۔ کچھ دیر میں باجی بھی اُٹھ گئیں۔ ہمیں مسکراتا دیکھ کر انھوں نے ان لوگوں کا جائزہ لیا تو وہ بھی ہنسنے لگیں ہمارے ہنسنے کی آواز سے سب ہی اُٹھ گئے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ یکایک امی کمرے میں داخل ہوئیں تو کمرے کا اور ہمارا حال دیکھ کر ڈانٹنے لگیں۔ یہ واقعہ آج بھی یاد آتا ہے تو ہم ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ بتانا بھول گئے کہ یہ واقعہ پچھلے سال کا ہے، جب سب کزن اکٹھے تھے۔ سچ بڑا مزا آیا

دادی جان کا لوٹا

صبا سلیم، کراچی

"پودے والا... پودے والا"

اس آواز سے ہمارے کان کئی برسوں سے مانوس تھے۔

چاچا صدرو پودے والا مہینے میں دو بار ہماری گلی میں پودے فروخت کرنے ضرور آتا۔ پچھلے کئی ماہ سے جب بھی چاچا صدرو کی آواز ہمارے کان میں پڑتی۔ ہمارا دل خون بنانے کا کام چھوڑ کر پودے خریدنے کے لیے مچلنے میں مصروف ہو جاتا۔ جب بھی ایسا ہونا بڑی مشکل ہوتی۔ مگر ہم امی سے جب بھی اپنی خواہش کا اظہار کرتے جواب ملتا۔

"چلو چلو بیٹھ کر پڑھو۔ کیا تمھیں مالی بننا ہے؟"

اور ہم اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ کیوں کہ منہ کے سوا ہمارے پاس لے کر رہ جانے کے لیے اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن آج جیسے ہی چاچا صدرو کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی ہم نے پکا ارادہ کر لیا کہ آج امی سے پیسے لے کر ہی چھوڑیں گے ورنہ...

"امی... وہ... چاچا صدرو آئے ہوئے ہیں۔"

ہم نے کچن میں مصروف امی کے پاس جا کر منمناتے ہوئے کہا۔

"کون چاچا صدرو؟" امی نے دیگچی میں ڈوئی گھماتے ہوئے پوچھا۔

"پودے والے چاچا صدرو۔" ہم نے نہایت تمیز کے ساتھ اطلاع دی۔

"تو؟"

"ہمیں پیسے دے دیجئے۔ پھولوں کے دو پودے خریدنے ہیں۔"

"کیوں خریدنے ہیں؟" امی نے عجیب سا سوال کیا۔

"ہمیں اچھے لگتے ہیں۔"

ہم نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا اور جواب دے کر مزید ڈر گئے کہ اگر امی نے پوچھ لیا کیوں اچھے لگتے ہیں؟ تو ہم کیا جواب دیں گے۔ بھلا کوئی چیز کسی کو کیوں اچھی لگتی ہے کسے معلوم؟

"اچھا... جاؤ پانچ روپے لے لو۔ دادی جان کے پاندان میں رکھے ہیں۔"

ہمیں امّی کے جواب پر یقین نہ آیا خیال گزرا کہیں "پلیز ہماری تسلی کے لیے اپنا جملہ دہرا دیجیے"، مگر پھر سوچا پودے تسلی سے زیادہ اہم ہیں۔

ممکن ہے امّی کی فیاضی کے پیچھے چھوٹے بھیّا کی نوکری کا ہاتھ ہو جو انھیں آج ہی ملی تھی۔

چاچا صدرو سے ہم نے گلاب اور چنبیلی کا ایک ایک پودا خریدا۔ پودے چھوٹے چھوٹے ڈبوں کے گملوں میں لگے ہوئے تھے۔ گملوں کی مٹی سوکھ چکی تھی۔ اس لیے فوراً پانی دینا ضروری تھا لیکن پانی کس سے دیا جائے؟ یکایک ہمارے ذہن میں دادی جان کا لوٹا اپنے پیندے کے سوراخ سمیت بجلی کی طرح کوندا۔ دادی جان اس لوٹے کو صرف وضو کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ اس لیے گھر میں یہ لوٹا "وضو والا لوٹا" کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ وضو کا لوٹا ہونے کے باعث اسے گھر میں ہم سے زیادہ عزت و وقار حاصل تھا۔ دادی جان وضو کرتے ہی لوٹے کو پاندان والے چھوٹے تخت کے نیچے چھپا دیتی تھیں۔ ہم نے نظر بچا کر لوٹا کھسکا لیا۔ ابھی ہم گلی کے پچھلے دروازے کے پاس موجود پودوں کو پانی دے رہے تھے کہ ریشماں نے ہمیں اپنی جاپانی گڑیا دکھانے کے لیے برابر والے مکان سے آواز دی۔ گڑیا اور وہ بھی جاپان کی۔ ہم لوٹے سمیت دوڑتے ہوئے ریشماں کے ہاں جا پہنچے دو گھنٹے بعد واپس لوٹے تو ہمارے ہاتھ خالی تھے۔ (یہ بات ہمیں اگلے روز معلوم ہوئی)

صبح کے چھ بجے ہوں گے سخت شور سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ آنکھیں اچھی طرح کھول کر دیکھا تو دادی جان کو غصے کے عالم میں اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرتے پایا۔ اٹھ کر پوچھا تو معلوم ہوا دادی جان کا چہیتا لوٹا غائب ہے تھوڑی دیر میں شور سے پورا گھر بیدار ہو کر صحن میں جمع ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی حج پر جانے والا ہے۔ تبھی دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ ہم نے دروازہ کھولا تو دیکھا ریشماں ہاتھ میں لوٹا لیے کھڑی ہے۔

"کیا تمھارے ہاں پانی نہیں آرہا؟" ہم نے آنکھیں ملتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"آنکھیں کھولیے مِس بُھلکڑ۔۔ یہ آپ کی دادی جان کا لوٹا ہے جسے آپ کل ہمارے گھر بھول آئی تھیں اور جس کے لیے آج صبح صبح آپ کے گھر میں اتنا شور مچا ہے۔ کہ ہم لوگ بھی جاگ گئے"، ریشماں نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"آہستہ بولو ریشماں کی بچی، اگر کسی نے سُن لیا تو؟" ہمارے ہوش ٹھکانے آچکے تھے۔ ابھی ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ منّی جو ہمارے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی لوٹا دیکھتے ہی چلّائی۔

"مل گیا۔ مل گیا۔ دادی جان کا لوٹا مل گیا"، منّی کے شور پر گھر بھر نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دادی جان لپکتی ہوئی آئیں اور ہمارے ہاتھ سے لوٹا چھینتے ہوئے بولیں۔

" اے کہاں سے ملا؟ کیا کسی نے باہر گلی میں پھینک دیا تھا۔ توبہ توبہ"

ریشماں نے دادی جان کو بتا دیا کہ لوٹا کب، کس طرح اور کس کے ذریعے کہاں پہنچا تھا۔ امّی نے بھی ریشماں کی تقریر سُنی تو ہمیں گھور کر دیکھا۔ ہم ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے اور صحن سے گزر کر کمرے کی جانب بڑھنے

لگے ۔ آدھے صحن سے گھوم کر دیکھا تو امی صحن کے کونے میں رکھے ہوئے پودوں کی جانب تیزی سے بڑھ رہی تھیں ۔

لڑاکا باز

ارشاد محمد شیخ ، حیدرآباد

ایف ۔ ۱۶ طیارے کا اصل نام "فائٹنگ فالکن" ہے ۔ جس کے معنی لڑاکا باز ہیں ۔ اس طیّارے کی رفتار آواز سے دُوگنی ہے اور اس میں لڑاکا اور دفاعی دونوں قسم کے سسٹم موجود ہیں ۔ ایف ۔ سولہ طیّاروں کو امریکی کمپنی "جنرل ڈائنامکس" تیار کرتی ہے تاہم یہ مکمّل طور پر اس کمپنی کے تیار کردہ نہیں ہیں بلکہ اس طیّارے کے کُل پُرزے اور حصّے اس وقت یورپ و امریکہ کی تقریباً تیس طیّارہ ساز کمپنیاں تیار کر رہی ہیں ۔

ایف ۔ ۱۶ طیّارہ پہلی بار ۱۹۷۲ء میں بنایا گیا ۔ بعد ازاں خاصے عرصے تک اس کو مختلف آزمائشوں سے گزارا گیا تاکہ اس کی مکمّل طور پر جانچ پڑتال ہو جائے ۔ اور خامیاں دور ہو جائیں ۔ پھر اسے موجودہ شکل میں لایا گیا ۔ ایف ۔ ۱۶ طیّارے کی قیمت تین کروڑ اسّی لاکھ ڈالر یا چالیس کروڑ روپے ہے ۔ ایک طیارہ مکمّل ہونے میں تقریباً تین سال لگتے ہیں ۔ ایف ۔ ۱۶ طیارے میں صرف ایک پائیلٹ بیٹھ سکتا ہے ، اس کا کاک پٹ ایئر کنڈیشنڈ ہے اور اس کے اگلے حصّے یعنی کاک پٹ کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس سے چاروں سمتوں یعنی ۳۶۰ درجے تک باآسانی دیکھا جا سکتا ہے ۔ ۱۵ درجے طیّارے

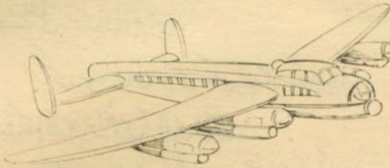

کی چونچ کی طرف ، ۴۰ درجے پیچھے کی طرف اور ۱۹۵ درجے سامنے کی طرف پائلٹ آسانی سے دیکھ سکتا ہے ۔ پائلٹ کے آرام سے بیٹھنے کی خاطر ۳۰ درجے سیٹ کو پیچھے کی طرف جھکا دیا گیا ہے ۔ طیّارے کی ونڈ اسکرین اور فریم بہترین پلاسٹک سے بنا ہے ۔ اس کی ساخت میں زیادہ تر المونیم کی بھرت استعمال کی گئی ہے ۔ اس کے پر پیچھے کی طرف چالیس درجے خم کھائے ہوئے ہیں ۔ اور پچھلا حصّہ قدرے اُوپر اُٹھا ہُوا ہے ۔ اس کے پَروں کے وہ سِرے جو درمیانی دھڑ سے جڑے ہوئے ہیں ، نسبتاً موٹے ہیں ۔ جس سے اس میں مضبوطی پیدا ہو گئی ہے ۔ اور دوسری طرف اس کے کُل وزن میں ۱۱۳ کلوگرام کمی ہو گئی ۔ اس وجہ سے اس کی رفتار اور پھُرتی میں اضافہ ہو گیا ہے اس کے پَروں کی حرکت خاص درجے اور مطلوبہ سمت میں آٹومیٹک طریقے سے ہوتی ہے ۔ اس کی دُم اس انداز میں بنائی گئی ہے کہ ضرورت کے مطابق گھوم سکے ۔ اس طیارے کی ساخت میں فولاد ، ٹائٹینیم اور المونیم جیسی مضبوط ترین دھاتیں استعمال کی گئی ہیں ۔

ایف ۔ ۱۶ کی رفتار قابو رکھنے کے لئے دُم کی

افقی سطح پر ہر دو طرف اسپیڈ بریکر لگے ہیں۔ ان میں سے ہر اسپیڈ بریک جہاز کا رُخ ساٹھ درجے تک موڑ سکتا ہے۔ راڈار کی مدد سے، ۳۰ سے ۵۶ کلومیٹر تک زمینی فاصلے کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اس راڈار کی مدد سے فضا میں ۴۶ سے ۴، کلومیٹر بلندی تک کی صورتحال دیکھی جا سکتی ہے۔ کاک پٹ کے سامنے چونچ کی طرف راڈار، فضائی اعداد و شمار جمع کرنے والا آلہ، اُڑان کنٹرول کرنے والا کمپیوٹر اور اُڑان کی سمت بتانے والا آلہ لگائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس طیارے میں راڈار، الیکٹرو آپٹیکل ڈسپلے، روشنی اور آواز کی مدد سے چلنے والا کیمرہ، آگ پر قابو پانے والا کمپیوٹر اور نشانے کا تعین کرنے والا آلہ بھی لگا ہے۔

الف۔۱۶ طیارہ کم سے کم فضائی علاقے میں پرواز کے دوران اپنا رُخ اور نشانہ بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب طیارہ کسی پوائنٹ پر حملہ کرنے کی پوزیشن پر آتا ہے تو اس کے آٹومیٹک کمپیوٹر رُخ کی صحیح سمت بنا دیتے ہیں۔ طیارے میں ۲۰ ایم ایم کی ایک توپ (جس سے ایک ہی وقت میں ۵۰۰ راؤنڈ فائر کیے جا سکتے ہیں) لگی ہے۔ اس کے علاوہ پَروں کے دونوں سِروں پر زیریں سرخ شعاعوں سے کام کرنے والے اور ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے دو میزائل بھی لگے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر درمیانی دھڑ کے نچلے حصے میں چھ میزائل بھی لگائے جا سکتے ہیں

الف ۱۶ میں ہوا سے ہوا میں، ہوا سے زمین پر مار کرنے والا راکٹ اور گنیں، الیکٹرو آپٹیکل ہتھیار، لیزر گائیڈڈ، خصوصی ہتھیار اور روایتی بم بھی لگے ہیں۔ چھوٹے سائز کا یہ لڑاکا طیارہ جس کی رفتار آواز سے تقریباً دُگنی ہے چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر صرف ایک منٹ میں پہنچ جاتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار فٹ کی بلندی تک جا سکتا ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار دو سو پونڈ بم لوڈ کی گنجائش ہے۔

اپنی محنت

محمد پرویز آرائیں
لاہور

آج راشد کا آخری پرچہ تھا۔ وہ جیسے ہی امتحان دے کر اسکول سے باہر آیا، اِسے طاہر مِل گیا۔ طاہر اس کا ہم جماعت اور بہترین دوست تھا۔ لیکن وہ راشد کی طرح پڑھائی میں ہوشیار نہیں تھا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے اسکول سے باہر آگئے۔ اچانک طاہر نے

کہا: "راشد! میں نے تم سے کوئی کوئی ایسی بات نہیں کی جس کو کہتے ہوئے میں نے ہچکچاہٹ محسوس کی ہو۔ لیکن آج میں تم سے ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں، جسے کہنے کے لیے زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔"

"لیکن وہ بات ہے کیا؟" راشد نے حیرت سے کہا۔

"دیکھو راشد تم تو جانتے ہی ہو کہ میں پڑھائی میں کمزور ہوں۔ اب تک تو میں کسی نہ کسی طرح پاس ہوتا رہا ہوں لیکن وہ چھوٹی جماعتوں کی بات تھی۔ اس مرتبہ نویں کلاس ہے اور پاس ہونے کی بہت کم اُمید ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے پاپا سے کہہ کر نمبر بڑھوادو۔" طاہر نے رُکتے رُکتے کہا۔ راشد کے پاپا انہی کے اسکول میں ماسٹر تھے۔

"لیکن تم کس مضمون میں نمبر بڑھوانا چاہتے ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کاپی پاپا کے پاس آئے ہی نا۔" راشد نے کہا۔۔۔

"جس مضمون کی بھی کاپیاں تمھارے پاپا کو ملیں۔ کیوں کہ میں تو ہر مضمون میں کمزور ہوں" طاہر نے جواب دیا۔

"میں کوشش کروں گا۔ ویسے اُمید نہیں ہے کہ پاپا اِس بات پر تیار ہو جائیں۔ اِس سِلسلے میں وہ بہت سخت ہیں۔۔۔"

"تم کہنا، مجھے اُمید ہے وہ تمھاری بات نہیں ٹالیں گے۔" طاہر نے کہا۔

یہ شِشماہی امتحان تھا۔ امتحان کے بعد ایک ہفتے کے لیے اسکول بند ہو گیا۔

راشد کے پاپا نویں جماعت کی کاپیاں جانچ رہے تھے۔ راشد بھی ان کے پاس بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد طاہر کی کاپی کا نمبر بھی آگیا۔ اس کے پاپا نے کاپی جانچی۔ طاہر کو بہت کم نمبر ملے۔ جب اس کے پاپا طاہر کی کاپی رکھنے لگے تو راشد نے ڈرتے ڈرتے کہا "پاپا!"

"ہوں۔" پاپا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"اس لڑکے کے نمبر بڑھا دیجیے۔" راشد نے طاہر کی کاپی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے پاپا نے ایک نظر کاپی کی طرف دیکھا۔ پھر راشد کو گھورتے ہوئے بڑی سختی سے کہہ دیا "نہیں"۔ اس نہیں کے بعد راشد کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی اور وہاں سے اُٹھ گیا۔

راشد نے طاہر کو پوری بات بتادی۔ طاہر رو پڑا اور کہنے لگا "کسی طرح بھی ہو راشد! میرے نمبر بڑھوادو میں تمھارا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔"

"لیکن طاہر! یہ تو شِشماہی امتحان تھا۔ تمھیں اتنی فکر کیوں ہے۔ تم سالانہ امتحان کے لیے خوب محنت سے پڑھو مجھے اُمید ہے تم ضرور پاس ہو جاؤ گے۔" راشد نے اسے سمجھایا۔

"نہیں راشد نہیں، کسی طرح بھی میرے نمبر بڑھوادو، ورنہ مجھے یقین ہے، میں فیل ہو جاؤں گا۔"

"آخر تم سمجھتے۔۔۔" راشد نے کہنا چاہا لیکن طاہر نے اس کی بات کاٹ دی "راشد میں کچھ سُننا نہیں چاہتا بس تم میرے نمبر بڑھوادو۔"

راشد نے اُسے بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانا۔ آخر کار راشد نے ایک بار پھر اس سے وعدہ کر لیا۔ طاہر سے وعدہ کرنے کے بعد راشد نے ایک ترکیب سوچی اور اس پر عمل کرنے کا موقع اُسے چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے مِل بھی گیا۔

شام کا وقت تھا۔ پاپا کہیں گئے ہوئے تھے اور گھر کے دوسرے لوگ کاموں میں مصروف تھے۔ وہ سب کی نظر بچا کر لائبریری میں چلا گیا۔ اس کے پاپا امتحانات کی کاپیاں وہیں رکھتے تھے۔ وہاں پہنچ کر اُس نے طاہر کی

کاپی نکالی اور نمبر بڑھانے کے بعد کاپی کو اُسی جگہ پر رکھ کر لوٹنے لگا لیکن۔۔۔ دروازے کی طرف مڑتے ہی اُس کو چکر سا آگیا۔ وہاں اُس کے پاپا کھڑے اُسے گھور رہے تھے۔ راشد اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اب وہ کبھی حرکت نہ کر سکے گا۔

"تم نے کاپیوں میں کوئی تبدیلی کی ہے؟" اس کے پاپا نے بھاری آواز میں پوچھا۔ راشد خاموش رہا تو انھوں نے آگے بڑھ کر سختی سے پوچھا "بولتے کیوں نہیں؟"

لیکن وہ خاموش رہا۔ دوسرے ہی لمحے پاپا نے غصّے میں آکر اُسے ایک تھپّڑ رسید کر دیا۔ آخر دو تین ہاتھ کھانے کے بعد اُسے ساری بات بتانا پڑی۔

"ہوں۔۔۔ تو تم اس قدر آگے بڑھ گئے۔ اچھا اپنی اور طاہر کی کاپیاں لاؤ۔" پاپا نے کہا۔ راشد نے دونوں کاپیاں نکال کر انھیں دے دیں۔ پاپا تھوڑی دیر تک ان کاپیوں میں کچھ تبدیلی کرتے رہے پھر انھوں نے دونوں کاپیاں راشد کی طرف بڑھا دیں۔ راشد نے کاپیاں دیکھیں۔ اُس کی کاپی پر پچھلے ملے ہوئے نمبروں سے بیس نمبر کم درج تھے اور طاہر فیل کر دیا گیا تھا۔ راشد کے آنسو نکل پڑے۔ پاپا بولے "دیکھو راشد! اگر تم مستقبل میں ایک اچھی حیثیت کے آدمی بننا چاہتے ہو تو اپنے دوستوں کو بھی اپنے جیسا ذہین بناؤ۔ ایمانداری ترّقی کے زینے کی ابتدائی سیڑھی ہے۔ خود کو اور اپنے دوستوں کو غلط راہوں پر مت بھٹکنے دو۔ اسی میں تمھاری اور تمھارے دوستوں کی بھلائی ہے طاہر کو سمجھاؤ۔ اگر وہ مان جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ تم اس سے ملنا جلنا چھوڑ دو۔" پاپا کے یہ الفاظ سُن کر راشد کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پاپا اُسے تنہا چھوڑ کر لائبریری سے نکل گئے۔

دوسرے دن طاہر سے ملنے پر راشد نے اُسے تمام باتیں بتا دیں اور کہا "طاہر! اگر تم چاہتے ہو کہ میرے دوست رہو۔ تو تمھیں بھی میرے ساتھ مل کر پڑھنا ہوگا۔ تاکہ تم بھی پڑھائی لکھائی میں کسی سے کم نہ رہو۔"

"ہاں راشد! میں ضرور ایسا کروں گا۔ تمھارے پاپا واقعی بہت عظیم شخص ہیں۔ میں ان سے بھی معافی مانگ لُوں گا۔" طاہر کے لہجے میں پشیمانی تھی۔

چند ماہ بعد سالانہ امتحان آیا اور گزر گیا اور پھر کچھ دِن بعد نتیجہ بھی معلوم ہو گیا۔ راشد اپنی کلاس میں اوّل آیا تھا۔ اُسے اپنے اوّل آنے سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ طاہر نے سالانہ امتحان کے لیے اتنی محنت کی تھی کہ وہ بغیر کسی بے ایمانی کے پاس ہو گیا تھا۔

عقل مند کسان

جہانگیر اعوان
آزاد کشمیر

کسی پہاڑ پر ایک کسان رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی فصل سے خوب کما لیا کرتا تھا۔ ایک دن وہاں سے شیطان کا گزر ہوا۔ اُس نے کسان سے کہا "جہاں تم فصل اُگاتے ہو، یہ زمین میری ہے۔"

کسان بہت ہی سادہ طبیعت انسان تھا۔ اس نے شیطان سے کہا "بھائی! اگر یہ زمین تمھاری ہے تو تم لے لو۔"

شیطان نے سوچا اور پھر بولا "نہیں بھائی یہ زمین تم اپنے پاس ہی رکھو، لیکن تم اس میں جو فصل اُگاؤ گے۔ اس میں سے آدھا حصّہ مجھے دے دینا۔ اس طرح تم بھی خوش رہو گے اور میں بھی" کسان نے ہامی بھرلی۔ اگلے سال اس نے گندم کاشت کی۔ فصل کاٹنے کے بعد اس نے مشین کے ذریعے فصل صاف کروائی۔ اس کے بعد اس نے گندم اور بھوسے کو الگ الگ بوریوں میں بند کر کے رکھ دیا۔

شیطان جب اپنا حصّہ لینے آیا تو کسان نے اُسے گندم اور بھوسے والی بوریاں دکھائیں اور پوچھا "تم کون سی چیز لو گے؟"

شیطان نے کہا: "میں بھوسے والی بوریاں لوں گا۔" کیوں کہ بھوسے والی بوریاں زیادہ تھیں۔

کسان ساری گندم بیل گاڑی پر لاد کر منڈی میں لے گیا۔ شیطان بھی بھوسہ لے گیا۔ دونوں نے اپنی اپنی چیزیں فروخت کرنا شروع کیں۔ کسان جلد ہی فارغ ہوگیا تو شیطان نے پوچھا: "تم جلدی کیسے فارغ ہوگئے؟"

کسان نے کہا: "یہ اُوپر کا پھل تھا۔"

اس پر شیطان نے کہا: "اگلے سال اُوپر کا پھل میں لوں گا۔"

کسان نے کہا: "اچھا بھائی! تم ہی لے لینا۔"

اگلے سال اُس نے آلو کاشت کیے۔ فصل تیار ہوئی تو اُس نے آلو الگ کیے اور پتے الگ۔ جب کسان نے شیطان سے پوچھا "تم کون سی چیز لوگے؟" تو شیطان نے پتے لیے۔

کسان آلو منڈی میں لے گیا۔ شیطان نے بھی ایسا ہی کیا۔ لوگوں نے جب شیطان کو پتے فروخت کرتے دیکھا تو اُس کی اچھی خاصی پٹائی کردی۔ جب دونوں گھر پہنچے تو شیطان نے کسان سے پوچھا: "آج میری پٹائی ہوئی، تمھاری کیوں نہیں ہوئی؟ اور آج تمھیں رقم بھی خاصی مل گئی ہے۔"

کسان نے کہا: "یہ نیچے کا پھل تھا، اس لیے میری پٹائی بھی نہیں ہوئی اور رقم بھی اچھی خاصی مل گئی۔"

شیطان بولا: "اگلے سال میں اُوپر اور نیچے کا حصہ لوں گا۔"

کسان نے کہا: "بھائی لے لینا۔ ایسی کیا بات ہے۔"

اگلے سال جب شیطان نے اپنے حصے کی فصل منڈی میں فروخت کرنا چاہی تو لوگوں نے اس کی فصل دیکھ کر اُس کی اتنی پٹائی کی کہ اُس نے کسان کی زمین کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور وہاں سے رفوچکر ہوگیا۔

ساتھیو! آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ کسان نے اس سال کون سی فصل کاشت کی؟ کسان نے اس سال مکئی کی فصل کاشت کی تھی اور اُس نے مکئی کے اُوپر کے پتے اور نیچے کی جڑیں شیطان کو دیں اور درمیانی حصہ یعنی مکئی کے دانے اپنے پاس رکھ لیے۔ اس طرح کسان نے اپنی عقل مندی کی وجہ سے ایک بڑی بلا کو دُور بھگا دیا۔

اُلّو کی عدالت میں

پرنس وسیم بن اشرف ——— میاں چنوں

کسی جنگل میں ایک اُلّو رہتا تھا وہ سارا دن آنکھیں بند کیے ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں بیٹھا سوچوں میں غرق رہتا۔ اس جنگل کے تمام جانور اور پرندے اُسے عقلمند سمجھتے تھے۔ جب کبھی ان میں جھگڑا ہوتا تو وہ اُس اُلّو کے پاس آتے اور اُلّو انصاف کر کے ان کی صلح صفائی کرادیتا۔

ایک دن ایک ہاتھی اور بندر اُلّو کے پاس آئے اور کہنے لگے "اے جنگل کے عقل مند اُلّو! ہم دونوں ایک بات پر جھگڑ بیٹھے ہیں۔ آپ اس بات کا فیصلہ کرادیجیے۔"

اُلّو نے اپنے پر سمیٹتے ہوئے کہا: "ہاں بتاؤ کیا معاملہ ہے؟"

بندر کہنے لگا: "میں کہتا ہوں، چالاکی اور تیزی اچھی ہے۔ جبکہ ہاتھی کہتا ہے کہ طاقت اور لڑائی سے زیادہ کوئی شے اچھی نہیں ہے۔" اُلّو آنکھیں بند کیے سُنتا رہا۔ پھر بولا: "تم دریا کے کنارے اُس پار سیب کا بڑا درخت دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"جاؤ اور میرے لیے وہاں سے کچھ سیب توڑ کر لاؤ۔" اُلّو نے حکم دیا۔ بندر اور ہاتھی سمجھے کہ اُلّو اس مشورے کی فیس لینے کی فکر میں ہے چنانچہ اُس کے لیے پھل لانے چل کھڑے ہوئے۔ دریا کے کنارے پہنچے تو بندر بولا: "میں تو اتنا بڑا دریا کبھی پار نہیں کرسکتا" ہاتھی مسکرادیا: "اب شاید تمھاری سمجھ میں آگیا ہوکہ طاقتور اور بڑا ہونا کتنا فائدے مند ہے۔

آؤ، میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو اُس پار لیے چلتا ہوں" بندر، ہاتھی کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ اور ہاتھی اُسے دریا کے پار لے گیا۔ جب وہ دریا پار پہنچے تو دیکھا کہ سیب بہت اونچائی پر تھے۔ ہاتھی نے اپنی سونڈ سے پھل توڑنے کی، بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا اب ہاتھی نے درخت گرانے کی کوشش کی، لیکن درخت بہت مضبوط تھا۔ بندر مُسکرایا اور بولا: "بھائی ہاتھی! لڑائی اور طاقت ہر جگہ کام نہیں آتی کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ چالاک اور تیز ہونا بہت ضروری ہے۔"

یہ کہہ کر بندر نے چھلانگ لگائی اور درخت کی چوٹی پر جا بیٹھا۔ اور وہاں سے سیب توڑ توڑ کر نیچے پھینکنے لگا۔ بہت سارے سیب توڑنے کے بعد وہ واپس ہوئے اور اُلّو کے سامنے رکھتے ہوئے بولے "دیکھئے ہم نے آپ کی شرط پوری کر دی اب بتائیے دونوں میں سے کون سی چیز اچھی ہے؟"

اُلّو بولا "تم نے خود ہی جواب دے دیا ہے۔ اب مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ دونوں نے حیران ہو کر پوچھا "وہ کیسے؟"

"چالاکی اور طاقت دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ ہاتھی کی مدد کے بغیر تم دریا پار نہیں کر سکتے تھے اور بندر کی پھرتی کے بغیر پھل حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان اور جانور کو اس کی عقل مندی اور طاقت کے لحاظ سے سُود مند بنایا ہے۔"

دوستی کا راز

مرسلہ، عبدالرشید اعوان کنڑی

ذیشان بہت ذہین اور ہونہار طالب علم تھا وہ ہر سال اسکول میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرتا لیکن اس کے باوجود بھی اس کے ہم جماعت اس سے نفرت کرتے تھے کیونکہ ذیشان ہر ایک سے بداخلاقی سے پیش آتا اور جب وہ آپس میں کوئی بات کر رہے ہوں تو یہ اپنی بات شروع کر دیتا اور بھر بولے جاتا اس کی بُری عادت سے تمام بچے اس سے نفرت کرتے تھے اور گھر والے بھی ذیشان کی اس عادت سے پریشان تھے۔ وہ روزانہ ذیشان کو سمجھاتے مگر ذیشان ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکال دیتا۔ وہ اکثر کلاس میں تنہا بیٹھا ہوا ہوتا تھا۔

ایک دِن اسکول میں ہاف ٹائم ہوا تمام بچّے اِس سے نفرت کیوں کرتے ہیں جب بھی وہ جاتا تو وہ وہاں سے بھاگ جاتے ہیں اسی طرح کے بے شمار سوالات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے ذیشان کو یہ معلوم نہ تھا کہ بچّے اس کی عادت سے بے زار ہیں۔ چنانچہ اسکول کی چھٹی ہوتے ہی گھر پہنچ کر بستہ ایک طرف رکھا اور ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگا

جب اس کی امّی نے پوچھا بیٹے کیا ہوا کیوں رو رہے ہو تو ذیشان روتے ہوئے بولا امی تمام کلاس کے بچے مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور جب میں جاتا ہوں تو وہ بھاگ جاتے ہیں اور میں کلاس میں تنہا بیٹھتا ہوں تمام بچّے فری پیریڈ میں اپنے دوستوں سے باتیں کرتے ہیں ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے ہیں امّی میں اس اسکول میں نہیں پڑھوں گا، پڑھوں گا تو ایک شرط پر اس کی امّی جلدی سے بولیں وہ کون سی شرط۔ ذیشان سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا کہ امّی مجھے آپ ایک ایسی ترکیب بتائیں جس سے تمام بچّے مجھ سے نفرت نہ کریں اور مجھ سے دوستی رکھیں تو اس کی امّی بولیں بیٹے ابھی تو مجھے گھر کا کام کرنا ہے میں تمہیں رات کو بتاؤں گی اور یہ بھی بتاؤں گی کہ وہ تم سے نفرت کیوں کرتے ہیں یہ کہہ کر اس کی امّی گھر کے کام میں مصروف ہو گئیں اور ذیشان رات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا آخر خدا خدا کر کے رات آئی اور ذیشان بھاگا بھاگا اپنی امّی کے پاس گیا تو اس کی امّی نے اسے بتایا بیٹے بچّے تم سے نفرت اس لئے کرتے ہیں کہ تم ان کے ساتھ نہایت بداخلاقی سے پیش آتے ہو اور جب وہ کوئی بات کر رہے ہوں تو تم بیچ میں اپنی بات چھیڑ

دیتے ہو اور دوسروں کی باتیں سنتے ہی نہیں۔

ذیشان نے اپنی امّی سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ ذیشان کی امّی نے کہا بیٹے جب تم کل اسکول جاؤ تو تمام بچوں سے سلام کرنا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق اور محبت سے پیش آنا اور جب کوئی باتیں کر رہے ہوں تو ان کی باتوں کو سننا اور آخر میں اپنی بات کہنا۔ اگر کوئی بچہ غریب ہو تو اس کی کبھی کبھی فیس دے دینا۔ اس طرح کے اچھے کام کرنے سے نہ صرف تمہارے کلاس کے بچے بلکہ اساتذہ بھی خوش ہوں گے۔ اس طرح تمہارے بہت سارے دوست بن جائیں گے اتنی باتیں تمہارے لئے کافی ہیں جاؤ اب سو جاؤ۔

صبح جب ذیشان اسکول گیا تو تمام بچوں سے سلام کیا اور ان کے ساتھ بڑے اخلاق اور ادب سے باتیں کی۔ کلاس کی تمام بچے ذیشان کی تبدیلی پر بہت حیران ہو رہے تھے وہ سوچ رہے تھے کہ ذیشان کل تو کیسا بُرا تھا۔ اس میں اتنے دِن کتنی بُری عادتیں تھیں۔ آج وہی ذیشان ایک نیک اور اچھا بچّہ بن گیا۔ اب کلاس کے بچے اس سے دور بھاگنے کے بجائے اس کے نزدیک بیٹھتے اور اس سے فری پریڈ میں باتیں کرتے اور دیکھتے ہی دیکھتے ذیشان کے بہت سارے دوست بن گئے۔

اب ذیشان ہر ایک کے ساتھ بڑے ادب اور اخلاق سے پیش آتا جب اس کے دوست اس سے پوچھتے کہ تم میں یہ تبدیلی کیسے آئی مگر وہ باتوں ہی باتوں میں ٹال دیتا۔

ہمارا پاکستان

کِس نے پاکستان بنایا
کِس نے ایسا باغ سجایا

کِس نے ہم کو دولت بخشی
کِس نے ہم کو عزّت بخشی

جس قائد کا ہے فرمان
اس پر جان کرو قربان

اُس قائد کا نام بتاؤ
اُس کا کوئی کام بتاؤ

قائدِ اعظمؒ اُس کا نام
جس نے بنایا پاکستان

مرسلہ۔ شبانہ عبدالغنی۔ لیاقت آباد

قلمی دوستی

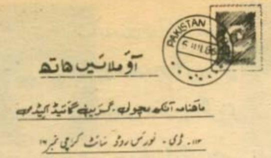

آؤ ملائیں ہاتھ

محمد یوسف ۱۶ سال
جماعت دہم ، کراٹے
مضمون ، انگریزی ، فوجی
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ ، ملک کی خدمت
کوارٹر نمبر ۱۲۳ - بلاک بی - ایوب کالونی - لطیف آباد حیدرآباد

عمران ۱۰ سال
جماعت چہارم ، فوٹوگرافی
مضمون حساب ، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ، وجہ ، دکھی انسانیت کی خدمت
مکان نمبر ۱۵/۸ - لال چند آباد نزد اہل حدیث مسجد میرپورخاص

مطلوب احمد ۱۱ سال
جماعت پنجم ، پٹھو گرم کھیلنا
مضمون اردو ، دکاندار
بننا چاہتے ہیں ، وجہ دکاندار اچھے لگتے ہیں۔
محلہ دربار شریف - وارڈ نمبر ۲ - کروڑ لعل عیسن

محمد عمران ۱۴ سال
جماعت ششم ، کرکٹ کھیلنا
مضمون ، اردو ، سائنسدان
بننا چاہتے ہیں - وجہ ، ملک کی ترقی
مکان نمبر ۵۴ - تحصیل و ضلع چکوال - بلکسر

نصیر احمد امان ۱۳ سال
جماعت ہشتم ، قلمی دوستی
مضمون ، اردو ، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں - وجہ ، لوگوں کا علاج
کوارٹر نمبر ۵ - بلاک ۲۰ - ملک وال

محمد بشیر ۱۳ سال
جماعت ہشتم ، کرکٹ کھیلنا
مضمون ، انگریزی ، ڈاکٹر
بننا چاہتے ہیں - وجہ ، قوم کی خدمت
۷/۲/۲ - نزد گماکا جی ہاؤس - زراعتی فارم - راولپنڈی

ذاکر غوری ۱۵ سال
جماعت ہشتم ، اسکاؤٹنگ
مضمون ، انگریزی ، پائیلٹ
بننا چاہتے ہیں - وجہ ، قوم کی مدد
معرفت محمد عثمان حلوائی - دولت پور سفن - ضلع نواب شاہ

رفاقت علی واجد ۱۵ سال
جماعت دہم ، کرکٹ کھیلنا
مضمون ، اردو ، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ، وجہ ، غریبوں کی مدد
پوسٹ آفس جنڈانوالا - تحصیل کھاریاں ، ضلع گجرات

نصیر احمد ۱۴ سال
جماعت ہشتم ، کرکٹ کھیلنا
مضمون ، انگلش ، ڈاکٹر
بننا چاہتے ہیں - وجہ ، خدمت خلق
ڈاکخانہ حضرو - گاؤں رجوں - تحصیل و ضلع اٹک

قاضی فخر شاہین ۱۵ سال
جماعت دہم ، شعر پڑھنا
مضمون ، بائیالوجی ، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں - وجہ ، ملک کی خدمت
محلہ قاضیاں داہلی - تحصیل جام پور - ضلع راجن پور

عبدالرزاق ندیم ۱۸ سال
جماعت ہفتم ، ہر اچھی کتاب کا
مطالعہ ، مضمون ، سائنس
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں ، وجہ ، دکھی انسانیت کی خدمت
مکان نمبر ۱۹ / سیکٹر ۵ - ۱۱ - بلاک نمبر ۱۲ - نیو کراچی - کراچی ۳۶

ارشد نوید شاہد ۱۳ سال
جماعت ششم ، قلمی دوستی
مضمون ، اردو ، فوجی
بننا چاہتے ہیں ، وجہ ، ملک کی سرحدوں کی حفاظت
نزد شفاخانہ حیوانات ، پھالیہ - تحصیل پھالیہ ، ضلع گجرات

دوست محمد قریشی ۱۸/ سال
جماعت دہم، قلمی دوستی
مطالعہ، مضمون، انگریزی
انجینئر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ، ملک کی خدمت
گورنمنٹ ہائی اسکول ۔ آب سر ۔ تربت مکران

جاوید عبداللہ گھانچی ۱۶/ سال
جماعت دہم، بیڈمنٹن کھیلنا
فزکس، لیبارٹری ٹیکنیشن بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ، شوق ہے ۔
سی ۶/۹۵ ۔ لال مسجد ۔ ملیر کالونی ۔ کراچی

خالد محمود، ۱۴/ سال
جماعت نہم، آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون حساب، فوجی افسر
بن کر ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ۔
۴۹۸ ۔ گلی نمبر ۲ سیکٹر اے کشمیر کالونی ۔ کورنگی روڈ ۔ کراچی ۔

اظہر محمود، ۱۶/ سال
جماعت دہم، قلمی دوستی
مضمون، حساب، فوجی بننا
چاہتے ہیں، وجہ، ملک کی خدمت
معرفت اسد بک سیلرز سیکٹر ۴/ الیف، بھٹی نگر، اورنگی ٹاؤن ۔ کراچی

علی اکبر، ۱۳/ سال
جماعت ہشتم، ٹکٹ جمع کرنا
مضمون، انگریزی، ڈاکٹر
بننے کا شوق ہے ۔
۳۲۲ ۔ بی ۔ سیٹلائٹ ٹاؤن ۔ راولپنڈی

محمد راشد، ۱۴/ سال
جماعت دہم، ٹکٹ جمع کرنا
مضمون، فزکس، جاسوس
بن کر ملک دشمنوں کا سراغ لگانا چاہتے ہیں ۔
معرفت عبدالرسول، محمد اسلم سوداگران چرم مارکیٹ روڈ ۔ نواب شاہ

ضیغم حسین، ۱۸/ سال
ایف ایس سی، مطالعہ کرنا
مضمون، بائیالوجی، ڈاکٹر
بن کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ۔
نزد نیو جنرل بس اسٹینڈ مظفر گڑھ

فیصل جدون ۱۱/ سال
جماعت ہفتم، مطالعہ کرنا
فٹبال کھیلنا، حساب، پائلٹ
بننے کا شوق ہے، وجہ، فضاؤں کی سیر کرنا چاہتے ہیں
معرفت بشیر ہارڈ ویئر اسٹور ۔ ڈاکی جھنگ ۔ تحصیل و ضلع ایبٹ آباد

اظہر حسین، ۱۳/ سال
جماعت نہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، حیاتیات، ڈاکٹر
بن کر قوم کی خدمت کا عزم ہے
ظفر ایگریکلچرل ورکشاپ سانگھڑ روڈ ۔ نواب شاہ ۔

سید اویس تسنیم، ۱۲/ سال
جماعت ہشتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، انگریزی، انجینئر
بن کر ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ۔
مکان نمبر ۷ ۔ ۲۱۰۱ شاہ فیصل اسٹریٹ ۔ ٹنڈو آدم

محمد رفیق علی گوہر، ۱۷/ سال
جماعت دہم، ٹکٹ جمع کرنا
مضمون، کیمیا، انسپکٹر بن
کر منشیات کا خاتمہ کرنے کا عزم ہے ۔
مکان نمبر ۲۹ ۔ گول چوک ۔ ملت کالونی ۔ یونس آباد ۔

ظہور الحق، ۱۳/ سال
نہم، کرکٹ اور مطالعہ کرنا
مضمون، سائنس، ڈاکٹر
بن کر خدمت خلق کریں گے ۔
مکان نمبر ۴۴ ۔ ۳۵ ۔ اے III مدنی کالونی ماڑی پور ۔ کراچی

مکرم رضا، ۱۷/ سال
جماعت دہم، قلمی دوستی
مضمون، انگریزی، فوجی افسر
بن کر پاکستان کا دفاع کرنا چاہتے ہیں ۔
۲/۳۲ جان سن کول بلاکس ۔ مغل پورہ لاہور

خرم رؤف، ۱۴/ سال
جماعت نہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، انگریزی، حساب
انجینئر بننے کا شوق ہے ۔
سی ۔ ۶۷ ۔ بلاک جے نارتھ ناظم آباد ۔ کراچی

محمد عمران خان، ۱۶/ سال
دہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون انگریزی، ڈاکٹر
بن کر خدمت خلق کرنے کا عزم ہے ۔
مکان نمبر ۱۰ ۔ سیکٹر نمبر ۱۳ ۔ جی ۔ اورنگی ٹاؤن ۔ کراچی

سعید محمد بلوچ، ۱۶/ سال
جماعت دہم، فٹبال کھیلنا
فزکس، فوجی افسر بن کر
وطن کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں
بلوچ جنرل اسٹور، رستم شہید روڈ ۔ ٹنڈو جام

زاہد حسین، ۱۵/ سال
جماعت دہم، مطالعہ کرنا
مضمون، انگریزی، پروفیسر
بننے کے خواہش مند ہیں
بی ۱۸/ سیٹلائٹ ٹاؤن ۔ جھنگ صدر ۔

یاسر خان، ۱۳/ سال
ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، سائنس، پائلٹ
بن کر ملک کی خدمت کا ارادہ ہے ۔
سی ۔ ۱ ۔ الحمید سوسائٹی ۔ ڈرگ روڈ ۔ کراچی ۔

حافظ عباس احمد ۱۷ سال
جماعت نہم، مطالعہ کرنا
مضمون ریاضی، کمپیوٹر
انجینئر بننا چاہتے ہیں، وجہ، شوق ہے۔
پورٹ بکس نمبر ۷، صادق آباد ضلع رحیم یار خان

محمد وقاص ۱۳ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون حساب، فوجی بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ، ملک کی خدمت
۹۵/۱۹ - النور سوسائٹی۔ کراچی

وسیم شاہ (شانی) ۱۷ سال
جماعت نہم، اچھی کتابیں
پڑھنا۔ مضمون، انگلش
اداکار بننا چاہتے ہیں، وجہ، اداکاری کا شوق
۳/C ایریا، نزد اسلام کریانہ اسٹور، سعید آباد، بلدیہ ٹاؤن، کراچی

روح الامین ۱۴ سال
جماعت ہشتم، لکھنا پڑھنا
مضمون، اُردو، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں، وجہ۔ وطن کی خدمت
گورنمنٹ ہائی اسکول۔ تورڈھیر تحصیل صوابی۔ ضلع مردان

منظور الٰہی ۱۶ سال
جماعت۔ انٹر، ٹکیٹ جمع کرنا
مضمون، اصولِ تجارت، سول
سروس اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ عوام کی خدمت
کوارٹر نمبر ۸-۲۱۳- گلی نمبر ۴۳ سیکٹر ۸۸-۶-G- اسلام آباد

عدنان محمود ۱۴ سال
جماعت نہم، کہانیاں لکھنا
مضمون، سائنس، ایئر فورس
میں جانا چاہتے ہیں۔ وجہ، شوق
مکان نمبر ۱-۱۳-۲۹۷- لطیف آباد- حیدر آباد

پرنس وسیم بن اشرف۔ ۱۵ سال
جماعت دہم، مطالعہ کرنا
فوجی افسر بن کر
جام شہادت نوش کرنا چاہتے ہیں۔
مکان نمبر ۲۵، گلی نمبر ۱۵، محلہ رحمانیہ۔ میاں چنوں۔

محمود الحق ۱۳ سال
جماعت ہفتم، قلمی دوستی
مضمون، اُردو، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ، قوم کی خدمت
معرفت نیا من پان ہاؤس۔ مکان نمبر ۲۳، ۸ نزد دارالعلوم کورنگی کراچی ۱۴

احمد منصور ۱۲ سال
جماعت ہفتم، ٹکٹ جمع کرنا
مضمون، سائنس، فوجی
بننا چاہتے ہیں، وجہ، ملک کی خدمت
مکان نمبر ۳۹- گلی نمبر ۴۳-۴۴/۱۰-G-۱۰- اسلام آباد

ذکی احمد ۱۶ سال
جماعت دہم، رسائل پڑھنا
مضمون، حساب، انجینئر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ، شوق ہے۔
ایم سی-۱۰۰۸، کے گرین ٹاؤن شاہ فیصل کالونی۔ کراچی

جاوید اقبال ۱۶ سال
جماعت ہشتم، خدمتِ خلق
مضمون، سارے، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ، بے سہاروں کی مدد
معرفت جمعہ خان آرائشین۔ فاطمہ کالونی۔ بکرا پیڑی۔ میوا شاہ روڈ کراچی ۵

اعجاز احمد ۱۲ سال
جماعت ہفتم، مطالعہ
مضمون، جنرل سائنس
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔ وجہ، دوسروں کی خدمت
کالونی ایگریکلچرل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ۔ جمرود روڈ۔ پشاور

- قلمی دوستی کے اِس کالم میں صرف اسکول کے طلب شریک ہو سکتے ہیں۔
- کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا۔
- خراب اور نامکمّل کوپن قابلِ قبول نہ ہوں گے۔

نام ------- عمر ------- جماعت -------
مشاغل ------- اسکول میں پسندیدہ مضمون -------
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ------- وجہ -------
پتہ -------

شین فاروقی

امّی ابّو کا صفحہ

بچپن انسانی عمر کا وہ زمانہ ہوتا ہے جب انسان کو اپنے ماحول کی بیشتر چیزیں پُراسرار معلوم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نارمل بچّے کے ذہن میں اپنے ماحول کو جاننے اور اُس کی پوشیدہ حقیقتوں کو دریافت کرنے کی شدید جُستجو پائی جاتی ہے۔ اسی جُستجو کے زیرِ اثر بچّہ اپنے بڑوں سے اپنے اِردگرد موجود اشیا کے بارے میں بے شمار سوالات کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُسے اُس کے سوالات کے اطمینان بخش جوابات فراہم کیے جائیں۔

جدید ذرائع ابلاغ نے معلومات کے سیلاب کو گھر گھر پہنچا کر بچّوں کے ذہنوں میں معلومات کی پیاس پیدا کر دی ہے۔ اس پیاس نے ہمارے دور کے بچّوں کو پہلے سے زیادہ پُرتجسس، حساس، سنجیدہ اور غور و فکر کرنے والا بنا دیا ہے۔ یہ ایک اعتبار سے مثبت عمل ہے، لیکن افسوس کہ ہمارے معاشرے کے بڑے افراد بچّوں کی اس ذہنی پیاس کی نوعیت اور اہمیت کا واضح احساس نہیں رکھتے۔

عام مشاہدہ ہے کہ ہمارے ہاں جب کوئی بچّہ اپنے والدین یا گھر کے کسی دوسرے بڑے فرد سے کسی چیز کے متعلق سوال کرتا ہے تو اُسے تین اقسام کے ردِّعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

(۱) اکثر بڑے افراد بچّے کے سوال کرنے کی عادت کو اپنے بڑاپے کی توہین محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ عام طور پر سوالات کرنے والے بچّے کو "بک بک کرنے والا" اور "دماغ چاٹنے والا" جیسے خطابات دے کر جان چھُڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۲) بعض بڑے افراد بچّوں کے کچھ آسان سوالات کے جوابات تو دے دیتے ہیں لیکن جب بچّے اُن سے ایسے سوالات پوچھتے ہیں جن کے جوابات اُن کے پاس نہ ہوں تو پھر وہ بچوں کو جھڑکنے میں لمحے بھر کی تاخیر نہیں کرتے

(۳) کچھ بڑے اپنی بزرگی کا بھرم رکھنے کے لیے بچّوں کو اُن کے سوالات کے غلط جوابات فراہم کرتے ہیں۔

بچّوں کے ساتھ یہ سلوک صرف گھروں ہی میں نہیں، تعلیمی اداروں میں بھی روا رکھا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال سے کون واقف نہیں کہ کلاس میں سوالات کرنے والے طلبہ و طالبات، اساتذۂ کرام کی عظیم اکثریت کی نظر میں ناپسندیدہ عناصر قرار پاتے ہیں اور اساتذۂ کرام موقع ملتے ہی اُن کی جسمانی و ذہنی گوشمالی کر کے اُنھیں اُن کے ساتھیوں کے سامنے شرمندہ کر دیتے ہیں۔

سوال کرنے کے عمل کی حوصلہ شکنی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بہت ذہین اور بے حد متجسس بچّے بھی رفتہ رفتہ کُند ذہن اور مُضمحل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اُن میں اپنے ماحول اور اپنے بڑے لوگوں کے لیے شدید ناپسندیدگی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ترقی کر کے کسی بھی مرحلے پر شدید نفرت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسے بچّے بڑے ہو کر انفرادی اور اجتماعی مسائل کے حل کے لیے دلیل و برہان کی بجائے طاقت اور تشدّد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں معاشرہ ہزار طرح کے فسادات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

اگر آپ کسی ذہین بچّے کے سرپرست ہیں تو خدارا اُس کے ذہنی ارتقا میں رکاوٹ نہ بنیے۔ اس کے سوالات کے معقول جوابات فراہم کرنے کی کوشش کیجیے۔ اگر آپ کو کسی سوال کا جواب معلوم نہ ہو تو اعتراف کر لیجیے۔ یا پھر اس کا جواب معلوم کر کے بچّے کے ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کیجیے۔ اِسی میں آپ کے بچّے کی، آپ کی، اور آپ کی قوم کی بھلائی ہے۔

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں !
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend
Net weight when packed
200 grams
TAPAL TEA
DANEDAR
ٹپال چائے
دانےدار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار، گہری رنگت، یادگار لذّت، ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین
MASS

REGD. No. M-266

OCTOBER 1988

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI